مجلّہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایما اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا۔

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماهنامہ ______ لاهور

خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25 بی گلبرگ۔ 2 لاہور 54660 ٹیلی فون: 876219 فیکس: 92-42-876219

فہرست مشمولات

لمعات	ادارہ	2
صبح بہار	علامہ غلام احمد پرویزؒ	6
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	علامہ غلام احمد پرویزؒ	14
موت کا ایک دن معیّن ہے؟	ڈاکٹر عبدالودود	50
سماجی عمل میں قول و فعل کا تضاد	بشیر احمد عابد (کویت)	56
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے	آفتاب عروج	69

CONVENTION

19-20-21 Oct 1995

انتظامیہ ادارہ طلوع اسلام

چیئرمین:- ایاز حسین انصاری

ناظم:- محمد لطیف چوہدری

مدیر مسئول:- محمد لطیف چوہدری

مجلس ادارت:- میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز

ناشر:- عطاء الرحمٰن ارائیں

طابع:- خالد منصور نسیم

مطبع:- النور پرنٹرز و پبلشرز

3/2 فیصل نگر ملتان روڈ لاہور۔

مقام اشاعت:- 25-B گلبرگ 2 - لاہور- 54660

جلد 48 شمارہ 8 اگست 1995ء

بدل اشتراک

فی پرچہ =/10 روپے

اندرون ملک سالانہ 120 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ 550 روپے

آسٹریلیا، امریکہ، کینیڈا 750 روپے

14 اگست کا پیغام

"کوفہ کا عامل جب حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو اس نے دیکھا کہ اسلامی حکومت کا امیر، جَو کی روٹی زیتون کے تیل کے ساتھ کھا رہا ہے۔ عامل نے کہا کہ آپ کے محروسہ علاقہ میں گیہوں کافی مقدار میں پیدا ہوتی ہے پھر آپ جو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں؟ فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ کیا گیہوں اتنی مقدار میں پیدا ہوتی ہے کہ ہر فرد مملکت تک اس کی روٹی پہنچ جائے۔

اس نے کہا کہ اس کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟

آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا امیر اس وقت تک گیہوں کی روٹی کیسے کھا سکتا ہے جب تک ہر اس شخص تک جو اس کے علاقہ میں آباد ہے گیہوں کی روٹی نہ پہنچ جائے!"

اگر باُو نرسیدی، تمام بولہبی است!

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جشنِ آزادی

زیر نظر پرچہ جب آپ کے ہاتھوں میں ہو گا تو آپ جشن آزادی منانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوموں کی زندگی میں بعض واقعات ایسے آتے ہیں جن کی یاد قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن "یاد" کوئی بُت نہیں ہوتی کہ اس کی پرستش کی جائے۔ یہ ذریعہ ہوتی ہے شعورِ ملّی میں اس انقلاب کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کا جس کی یاد قائم رکھی جاتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی ملّی زندگی میں اس قسم کا ایک انقلاب آفریں دن آیا تھا جسے ہم یومِ آزادی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ دن درحقیقت ایک حدِّ فاصل تھا ہماری گذشتہ اور آئندہ زندگی میں۔ یہ دن تھا اس عہد کا کہ ہماری آنے والی زندگی گذشتہ زندگی سے یکسر مختلف ہو گی۔ ہماری گذشتہ زندگی تھی غیروں کے بنائے ہوئے نظام کے تابع چلنے کی۔ وہ نظام جو موجب تھا ہماری انفرادی اور اجتماعی خباثتوں کا۔ جو ذمہ دار تھا ہماری فاقہ کشی اور فلاکت زدگی کا۔ جو سبب تھا ہمارے اخلاقی سفل اور تعلیمی تنزل کا۔ جس نے ہمیں انسانیت سے یکسر بے بہرہ بنا رکھا تھا۔ جس نے انسانوں کی دنیا کو درندوں کا بھٹ بنا رکھا تھا۔ جس میں ہر سرمایہ دار غریبوں کی محنت کے اثمار و نتائج پر سانپ بن کر بیٹھا رہتا تھا۔ جس میں مزدوروں کے خون کی سرخی' اربابِ ثروت کے عشرت کدوں کی رنگینی کا سامان فراہم کرتی تھی۔ جس میں ان کی ہڈیاں' امراء کے قصرِ تعیّش کے لئے چونا بنتی تھیں۔ وہ نظام جس نے ہمیں انسانیت سے بہت نیچے گرا کر' حیوانی سطح پر لاکھڑا کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی نیچے۔ چند لفظوں میں یوں کہئے کہ وہ نظام جس نے ہمیں خیر و برکت کے سرچشمۂ ابدی (ذاتِ خداوندی) سے بہت دُور پھینک دیا تھا۔ 14 اگست 1947ء کا دن اس اعلان کا دن تھا کہ **"جاء الحق و زھق الباطل"** وہ انسانیت سوز نظام ختم ہوا اور اب اس کی جگہ ایک نئے نظام کا دور شروع ہوا۔ جس کا سرنامہ "احترامِ آدمیت" ہے۔ کسی کو اس اعلان میں شبہ ہو تو ہو' لیکن یہ حقیقت ہے کہ قوم نے اس اعلان کو بالکل یہی سمجھا تھا۔ اس نے دس سال اسی "اعلان" کی خاطر جدوجُہد کی تھی۔ ہم نے اپنے دعوٰے کی بنیاد اسی اعلان پر رکھی تھی۔ اس لئے 14 اگست 1947ء کا دن اسی

اعلان کا دن تھا۔ 14 اگست 1948ء کو اس کی پہلی سالگرہ منائی گئی تھی اور اب 14 اگست 1995ء کو اس کی 48 ویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔

ہم کسی تفصیل میں اُلجھے بغیر' پاکستان کے تمام اصاغر و اکابر سے خدا کے نام پر پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا فی الواقع 14 اگست 1947ء کا دن تمہاری پہلی اور بعد کی زندگی میں حدِّ فاصل بن گیا تھا اور کیا اس کے بعد ان 48 برسوں میں تم نے اس حد سے دو قدم بھی آگے بڑھائے ہیں؟ اس کا جواب باہر سے نہ مانگئے۔ خود اپنے دل سے مانگئے۔ اِقْرَأْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ الْحَسِيْبًا (17/14)۔

"اپنا اعمال نامہ پڑھ"--- کہ یہ گھڑی محشر کی ہے" تو عرصۂ محشر میں ہے--- اور پھر کسی اور سے شہادت طلب نہ کر بلکہ اپنے آپ سے پوچھ کہ آج خود تیری ذات تیرے محاسبے کے لئے کافی ہے۔ یوں محاسبہ کر اور پھر سوچ کہ کیا تیری غیرت گوارا کرتی ہے کہ تو اس مزعومہ "حدِّ فاصل" کی یاد میں جشنِ مسرّت منائے؟ اگر تمہارا دل فی الواقع گواہی دیتا ہے کہ 14 اگست 1947ء کا دن' تمہاری زندگی میں ایک حدِّ فاصل' بن گیا تھا اور اس کے بعد تم اس حد سے برابر آگے بڑھے جا رہے ہو تو تمہیں زیب دیتا ہے کہ اس دن کی یاد میں چراغاں کریں' جشن منائیں۔ ساری دنیا کو اس انقلاب عظیم پر دعوت فکر و نظر دیں۔ اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے سر اُٹھا کر چلیں۔ لیکن اگر آپ کا دل اس کی گواہی نہیں دیتا تو اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھیں کہ یہ دھوکا آپ کو اپنوں اور بیگانوں سب کی نظروں میں ذلیل کر دے گا۔

قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

من استوی یوماہ فھو مغبون

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ :

جس شخص کی زندگی کے دو دن ایک جیسے گذر جائیں (یعنی اس نے گذشتہ کل کے مقابلہ میں آج کوئی ترقی نہ کی ہو) وہ سخت نقصان میں رہا۔

(الحدیث)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صُبحِ بہار

12 ربیع الاول کے اس یوم مقدس کی یاد میں جب فاران کی چوٹیوں سے اس آفتابِ جہاں تاب کا طلوع ہؤا جس کی رحمت و ہدایت کی روشنی تمام کرۂ ارض کی تاریکیوں کے لئے پیامِ سحر تھی۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی وہ معنیٔ کونین
وہ جانِ حُسنِ ازل و بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کُنجِ حرا
وہ دل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دو جہاں، وہ محمدِ عربی
بروحِ اعظم و پاکش درود لا محدود

اللھم صلِّ وسلّم علی نبینا محمد ختم المرسلین رحمۃ للعالمین شاھدا و مبشرا ونذیرا۔ وداعیا الی اللہ باذنہ و سراجا منیرا

آبروئے ما زنام مصطفیٰ ست

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

علّامہ غلام احمد پرویزؒ

صُبحِ بہار

(نذرانۂ عقیدت بحضور سرورِ کائناتؐ)

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ اَت تعبیرِ خوابِ زندگی

جب زمین گرمی کی شدّت سے بتمتما اُٹھتی ہے۔ تمازتِ آفتاب اس کی رگ رگ سے نمِ زندگی چُوس لیتی ہے۔ آسمان کی شعلہ ریزیاں ساری فضا کو دہکتا ہُوا انگارہ بنا دیتی ہیں۔ بادِ سموم کی ہلاکت سامانیاں تازگی و شگفتگی کی ہر نمود کو جھلس ڈالتی ہیں۔ پھُول مُرجھا جاتے ہیں۔ شگوفوں کی گردن کے منکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لالہ کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ پتیاں سُوکھ جاتی ہیں۔ شاخیں پژمُردہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ سرو و صنوبر آتشدانِ ارضی کے دُودکش دکھائی دیتے ہیں۔ تابندہ چشمے دیدۂ کور کی طرح بے نُور ہو جاتے ہیں۔ مرمریں ندیاں خطِ تقدیرِ محکوماں کی طرح بے آب رہ جاتی ہیں۔ لُو کی دہشت سے سارے کانپتے ہیں۔ راستے ہانپتے ہیں۔ خنکی غاروں میں منہ چھپا لیتی ہے۔ ٹھنڈک سہم کر کنوؤں میں جا دبکتی ہے۔ وفورِ تپش سے سینۂ کائنات میں سانس رُکنے لگتی ہے۔ جنگل کے جانور آسمانی شعلوں کی لپیٹ سے کہیں پناہ نہیں پاتے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں نرم و نازک زبانیں نکالے نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ طائرِ نگاہ تک بھی کاشانۂ چشم میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ انسان، زندگی اور اس کی تمام لطافتوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوختہ بخت کسان کھیت کے کنارے کھڑا للچائی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف تکتا ہے کہ کہیں سے اُس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان دکھائی دے، لیکن اس کی خاسر و نامراد نگاہیں، حسرت بن کر اس کے ویرانۂ قلب میں لوٹ آتی ہیں۔ اس طرح جب حیاتِ ارضی کے کسی گوشے میں بھی اُمید کی نمی باقی نہیں رہتی اور بساطِ کائنات کے کسی کونے میں بھی زندگی کی کوئی تازگی دکھائی نہیں دیتی تو یاس و ناامیدی کے اس انتہائی عالم میں مبداء فیض کی کرم گستری سے سحابِ رحمت کسان کی آنکھوں کا نُور بن کر فضائے آسمانی پر چھا جاتا ہے اور اپنی جواہر پاشیوں اور گہر ریزیوں سے دامنِ ارض کو بھرپور کر دیتا ہے۔ زمینِ مردہ میں پھر سے زندگی آجاتی ہے۔ رگِ کائنات میں

نبضِ حیات پھر سے متموّج ہو جاتی ہے۔ فضا کے سینے میں رُکی ہوئی سانس پھر سے زندگی کی جوئے رواں بن جاتی ہے۔ چشموں کی خشک آنکھیں شرابِ زندگی کے چھلکتے ہوئے جامِ نُور بن جاتی ہیں۔ ندّیوں کی بے آب سیریں' بادۂ جاں فزا کی مسیحا نفسی سے رگِ جان میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سہمی ہوئی خنکیاں غاروں سے نکل کر فضاؤں پر چھا جاتی ہیں۔ دبکی ہوئی برودتیں' کنوؤں کی تہوں سے اُچھل کر بساطِ ارض پر پھیل جاتی ہیں۔ خشک پتیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ مُرجھائے ہوئے پھولوں میں از سرِ نو تازگی و شگفتگی آجاتی ہے۔ شگوفے چٹکتے ہیں' کلیاں مہکتی ہیں' ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے نفیس و لطیف جھونکے سرسبز و شاداب درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھولوں میں یوں جنبش' پیدا کر دیتے ہیں گویا-- بہار جھُول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں---- ہر طرف ایک نئی زندگی' اور ہر سمت ایک حیاتِ تازہ' جھُومتی' مسکراتی' مچلتی' لُوٹتی' ایک ایسی جنّت نگاہ بن جاتی ہے' جس کی ہر روش میں مسرتوں کے چشمے اُبلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں-

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَ یَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ط (42/28)-

اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے جو ایسی ناامیدیوں کے بعد اپنے سحابِ کرم کو بھیجتی اور اس طرح اپنی بساطِ رحمت کو صفحۂ ارض پر بچھا دیتی ہے-

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ط **حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ** ط (7/57)-

اسی کی ذات ہے جو (زمین کے جُھلس جانے کے بعد) اُن ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اُس کے ابرِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نَو کی بشارت دیتی ہیں پھر' جب وہ ہوائیں' پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اُڑتی ہیں تو خدا کا قانون اُنہیں زمینِ مردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے- وہاں اِن بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے' اِسی زمینِ مردہ سے' ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے ہیں اور ہر طرف زندگی کی نمود ہو جاتی ہے-

فَانْظُرْ اِلٰۤی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط (30/50)-

پس اگر تم آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو تو اللہ کے اِن آثارِ رحمت کو دیکھو اور غور کرو کہ وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کس طرح حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے-

یہ فطرت کا نظام ہے۔ یہ اُس کا قانون ہے جس کے قوانین اٹل اور جس کے آئین غیر متبدّل ہیں۔ یہ اُس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں ہؤا کرتی، کہ تبدیلیاں زمان و مکان کے تغیّرات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اُس کی ذات زمان و مکان کی قیود سے ماورا اور اُن کے اثرات سے بے نیاز ہے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے انسانیت کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ وہاں بھی یہی اصولِ فطرت کس طرح عمل پیرا ہے۔ یہ مادی تشبیہات و استعارات بھی درحقیقت اسی مقصد کے لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ انسان ان محسوسات کی راہوں سے مجرّد حقیقتوں کی طرف آئے اور جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہے اس سے عالمِ انفس پر دلیل لائے۔ گذشتہ اوراق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیائے انسانیت کی کیا کیفیت ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادداشتیں اس پر شاہد ہیں کہ اُس وقت عالمِ انسانیت کی خشک سالی اس سے کہیں زیادہ شدید و مہیب تھی جس کا خشیبی منظر اُوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ اُس وقت شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدّن کے پھول، وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مُرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے، لیکن فصلیں بالکل اُجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و نااُمید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں اور ایک پُکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ متٰی نصر اللّٰہ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس افسردگی و پژمُردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔ چنانچہ اس کے لئے اُس ربِّ ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ اُمیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاول کے مقدّس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جُھوم کر آیا اور بلدِ امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا، جس سے انسانیت کی مُرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اُٹھیں۔ اخلاق و تمدّن کے پژمُردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نُزہت و لطافت پیدا ہو گئی، اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے حیاتِ تازہ کے جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارکباد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اُس ذاتِ اطہرؐ و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی، جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی، جو علم و بصیرت کے اس اُفقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و

عشق، فکر و نظر، دین اور دنیا، قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ نورانی و حکمتِ بُرہانی کے اُس مقام پہ بلند پر فائز ہے، جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ ہاں تو، آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جُھک جُھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا۔ نوامیسِ فطرت نے "جنّت سے نکالے ہوئے آدم" کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت اُلٹ گئے کہ وہ آنے والا آگیا۔ جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب سے انسانی تصوّرات کی دنیا نار کی جگہ نُور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بُت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جَور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے رُوپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہو گئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے "جگمگاتا چراغ" کہہ کر پکارا **اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا** ○ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ **وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ** (7/157)۔ جب وہ آیا تو اُس نے اُن تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ احبار و رہبان کی تقلید کے اطواق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کے استبداد کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں۔ تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کُش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس طائرِ لاہُوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذنِ بال کشائی عطا ہوا اور انسان ایک مرتبہ پھر زمین پر سر اُونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے فاروقی عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہ، آمد و لیکن
جہان شوق را پروردگار است

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى (30/50)۔ اِس طرح وہ دلوں کی مُردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

اسی حقیقتِ باہرہ کو باندازِ دگر دیکھئے۔ آویزشِ ابلیس و آدم سے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتدا ہوئی۔

ابلیسانہ قوتوں کی تائید میں، کشش و جاذبیت کا وہ تمام تگاہ فریب سامانِ رنگ و عطر تھا جو نگار خانۂ طلسم و حیرت کے دامن میں بھر کر رکھ دیا گیا تھا۔ دوسری طرف انسانی راہ نمائی کے لئے پیغامِ ازلی تھا جو مبداء فیض کی شانِ ربوبیت سے انسانوں تک پہنچتا رہا۔ عقلِ خود بیں طبیعیاتی زندگی ہی کو سفرِ حیات کی آخری منزل قرار دے کر، اعلیٰ مقاصد اور بلند اقدار کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن یہ پیغامِ ازلی اس کے سامنے طبیعیاتی زندگی کی آرائشوں کے ساتھ ساتھ شرفِ انسانیت کی بلند حقیقتوں کو بے نقاب کرتا تھا۔ اس پیغام کی لِم ایک تھی۔ حقیقت ایک تھی۔ لیکن جُوں جُوں اس طلسم کدۂ رنگ و بو کی پیچیدگیاں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں، اس تعلیم کی جزئیات میں مناسب ردّ و بدل اور ضروری تغیّر و تبدّل ہوتا جاتا تھا، تاکہ طبعی ارتقا کے ساتھ ساتھ، جوہرِ انسانیت میں بھی بتدریج ارتقا ہوتا جائے۔ یہ ارتقائی مدارج تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ کاروان سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان پیغمبرانِ حیاتِ جاوید کا ہر ایک قدم ایک خاص سمت اُٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک آخری مستقر کی طرف اشارہ کرتا جاتا۔ چنانچہ آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتہ نشان بتا کر جاتا۔ تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ بلا تأمّل و توقف اس کے پیچھے ہو لے اور راہ گم کردہ، مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیران نہ پھرتا رہے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کڑی، سلسلہ کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتابِ فطرت کے اوراق و ابواب تھے جن میں کتاب کا ہر ورق اور ہر باب، کتاب کے آخری باب کی تمہید تھا۔ یہ سب ایک ہی شجرِ طیّب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گلِ سر سبد کے لئے نویدِ بہار تھیں۔ چنانچہ جب مشیتِ ایزدی کی یہ تدبیرِ محکم جس کے لئے زمین و آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آگئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دُھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشاد پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل و گوہر کو سمو لے تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنّت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آگئی۔ ہر طرف سے مسرّتوں کے چشمے اُبلنے لگے۔ چاند مسکرایا۔ ستارے ہنسے۔ آسمان سے نُور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصوّر بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اُٹھائی کہ آج اُس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی

[illegible] کا وقت پہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے۔ بلدِ امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد تھی جس کی طرف جبلِ تین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہِ تسکینِ خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیلِ اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں' آیا اور اس شانِ تجلّی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا' سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جُھولا جُھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدّس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اٹھے۔ فضائے عالم صلوٰۃ و سلام کی فردوس گوش صداؤں سے گونج اُٹھی۔ اور اِنس و جان وجدو کیف کے عالم میں پکار اُٹھے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
درجہانِ ذکر و فکر و انس و جاں
تو صلوٰۃِ صبح' تو بانگِ اذاں

یہ آنے والا رسولؐ کافۃً للنّاس اور رحمۃً للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حرّیت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اسی کتابِ مُبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دُنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اُسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبویؐ میں اُتاری گئی۔ شامِ جاں نوازنے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی' وہ لالہ و یاسمن کی اُن ہی پتّیوں کی رہینِ منّت تھی جن کا گلدستہ اِس نبیٔ آخرالزماںؐ کے مقدّس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ اُن ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ اُن ہی درخشندہ و تابندہ ذرّاتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو اُن کے ستائش گروں کی غلوٗ آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستوٗر کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتّیاں تھیں یہ پھُول تھا۔ وہ ذرّے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے

یہ سمندر تھا- وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھی- وہ افراد تھے' یہ مِلّت تھی- وہ نُقطے تھے' یہ خطِّ مُستقیم تھا- وہ ابتدا تھی' یہ انتہا تھا-

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃً للعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا' شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے- اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی- اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وُہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اُس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اُٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہِ مصطفیؐ رو

یہ تھا حاصلِ بہارِ چمنِ کائنات' کہ جس کا ظہور' صبحِ بہارِ کائنات تھا-

وہ رازِ خلقتِ ہستی' وہ معنیٔ کونین
وہ جانِ حُسنِ ازل وہ بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم' نازنینِ کُنجِ حرا
وہ دل کا نُور وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دو جہاں وہ محمدِؐ عربی
بروحِ اعظم و پاکش درود لا محدود

ان الله و ملئکته یصلون علی النبی
یایها الذین امنوا صلوا علیه و سلموا تسلیما○ (33/56)-

(ماخوذ از "معراجِ انسانیت")

CONVENTION
19-20-21
Oct 1995

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

علّامہ غلام احمد پرویزؒ

اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟

برادرانِ عزیز!

ایک اہم سوال جو اکثر ذہنوں میں اُبھرتا اور دلوں کو پریشان کرتا ہے' یہ ہے کہ عام اخلاقی اقدار تمام مذاہب (بالخصوص بڑے بڑے مذاہب) میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ سب مذاہب یہی کہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ دیانت دار بنو۔ کسی پر ظلم نہ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اسلام بھی یہی کہتا ہے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بناء پر ہم یہ کہتے ہیں کہ دینِ برحق صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا خدا کے ہاں کوئی اور دین قابلِ قبول نہیں۔ نوعِ انسان کی نجات و سعادت اسی سے وابستہ ہے' اس لئے تمام اہلِ مذاہب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام قبول کریں۔

اہم سوال اگر وہ خصوصیت جن کی بنا پر اسلام کو یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے' یہی اخلاقی اقدار ہیں' تو پھر یہ حق ہر ایک مذہب کو پہنچنا چاہئے۔ یہ تو کوئی معقول بات نہ ہوئی کہ جن خصوصیات کی بناء پر ہم اسلام کو دین الحق قرار دیں' انہی کے مطابق جب دوسرے مذاہب اپنے متعلق اسی قسم کا دعویٰ کریں تو ہم ان کے دعویٰ کو باطل قرار دے دیں اور ان سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کریں!

برہمو سماجی مذہب یہ سوال واقعی اہم ہے اور' جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' یہ اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتا اور قلوب کو پریشان کرتا ہے۔ یہی وہ سوال ہے جو اس سے پہلے علمی دنیا میں اس وقت سامنے آیا جب مولانا ابو الکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر سورۂ فاتحہ میں لکھا کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں" اس لئے کسی مذہب کو دوسرے مذاہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ یہ اعلان درحقیقت صدائے بازگشت تھی برہمو سماجی تحریک کی جو اس سے پہلے بنگال میں اُٹھی تھی۔ انہوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب کی (مبیّنہ) آسمانی کتابوں سے (بزعم خویش) اچھی اچھی باتوں کو یکجا کر کے ایک مجموعہ تعلیم مرتّب کیا اور اسے دُنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اس تعلیم میں تمام مذاہب کی مشترکہ سچائیاں موجود ہیں' اس لئے مذہبی اختلافات

مٹانے اور سچائی پر عمل پیرا ہونے کا یہی طریق ہے کہ تمام اہلِ مذاہب اس تعلیم پر ایمان لے آئیں اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیں۔ یہ مشترکہ تعلیم انہی اخلاقی اقدار پر مشتمل تھی۔ برہمو سماجی تحریک سے بہت پہلے اکبر کے "دینِ الٰہی" کی بنیاد بھی اسی تصوّر پر تھی۔ اسی کا مبلغ داراشکوہ تھا جس کے تصوّف کی رُو سے "رام اور رحیم" میں کوئی فرق نہیں اور حقیقت کا جلوہ دَیر و حرم میں یکساں موجود ہے۔ اسی کی صدائے بازگشت، بھگت کبیر اور سُور داس کے بھجنوں اور شاہ فرید اور سلطان باہو کی کافیوں میں ہر گلی کوچے میں سنائی دیتی ہے۔

مذہب کی بھی ضرورت نہیں! اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر صداقت اِنہی اخلاقی اقدار کا نام ہے اور اِنہی پر عمل پیرا ہونا انسانی زندگی کا منتہٰی ہے تو اس کے لئے..... مذہب کی بھی کیا ضرورت ہے۔ وہ لوگ جو کسی مذہب کے پیرو نہیں۔ جو خدا کی ہستی تک کے بھی منکر ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ جھُوٹ بولنا بہت بُرا ہے۔ سچ بولنا چاہئے۔ دیانتدار بن کر جینا چاہئے۔ کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے مذہب کو بیچ میں لانے کی ضرورت کیا ہے؟ یہی وہ تصوّر تھا جس کی بنیادوں پر یورپ میں (Humanism) کی تحریک اُٹھی اور اس نے (Religion without Revelation) "مذہب بلا وحی" کے دعوٰے کے ساتھ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگر مذہب کا مقصود و منتہٰی یہی اخلاقی اقدار ہیں اور انسانی زندگی ان اقدار کو مان لینے سے اپنی منزل تک پہنچ سکتی ہے تو پھر (Humanism) کے دعوٰی کو کس طرح ٹھکرایا جا سکتا ہے؟۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ سوال کس قدر اہم ہے اور اس کے اطمینان بخش جواب کا سامنے آنا کس قدر ضروری؟ اس اہمیت اور ضرورت کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق سنجیدگی سے (Seriously) سوچا جائے اور اسے انتہائی غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ **وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم**

دین کیا ہے؟ اس باب میں بُنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ دین کو صرف ایک اخلاقی ضابطہ (Ethical Code) سمجھ لیا جاتا ہے، اور بس۔ دین، چند اخلاقی اقدار کے مجموعہ کا نام نہیں۔ یہ ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی (System of Life) ہے جو حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اخلاقی اقدار اس نظام کے اندر بروئے کار آتی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ یہ نظام، انسان کو وہ بنیادیں عطا کرتا ہے جن پر اخلاقی اقدار کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ساری دنیا یہ کہتی ہے کہ جھُوٹ بولنا برا ہے۔ بد

باتیں سخت معیوب ہے۔ فریب دہی بڑی مذموم حرکت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ساری دنیا جھُوٹ بولتی ہے۔ یہ باتیں عام ہو رہی ہے۔ فریب دہی کی گرم بازاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ انسان ان تمام باتوں کو بُرا کہنے کے باوجود' انہیں کیوں اختیار کئے ہوئے ہے؟ وہ ان حرکات کو انتہائی معیوب اور مذموم سمجھنے کے باوجود انہیں کیوں نہیں چھوڑتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ یا تو ان اخلاقی اقدار کا محض رسماً" اور تقلیدی" اقرار کرتے ہیں اور یا ان کی بنیاد محض جذبات پر ہوتی ہے۔ انہیں اس کا کچھ علم نہیں کہ ان اقدار کو کیوں اختیار کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی کیوں نہ کی جائے۔ آپ کسی شخص سے کہئے کہ وہ آپ کو مطمئن کرے کہ آپ جھوٹ کیوں نہ بولیں۔ سطحی گفتگو سے ذرا نیچے اُترنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہو گا۔ وہ دلیل و برہان سے آپ کی "کیوں" کا کچھ جواب نہیں دے سکے گا۔ وہ آپ کو علیٰ وجہ البصیرت (Rationally) نہیں سمجھا سکے گا کہ جھُوٹ بولنے سے آپ کا کیا نقصان ہو گا اور سچ بولنے سے آپ کا کیا فائدہ ہو گا اور چونکہ انسان اسی بات کو اختیار کرتا ہے جس میں اس کا فائدہ ہو اور اسی چیز کو چھوڑتا ہے جس میں اس کا نقصان ہو' اس لئے' اس کا یہ اقرار تو محض رسمی اور تقلیدی ہوتا ہے اور یا جذباتی عواطف کا پیدا کردہ۔ وہ نہ ان اقدار کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھتا ہے اور اس لئے نہ انہیں اپنی زندگی کا مسلک بناتا ہے۔

دین وہ بُنیادی تصوّرات عطا کرتا ہے جن کی رُو سے انسانی زندگی کا مقصد اور منتہیٰ نمایاں طور پر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ مقصدِ زندگی' دنیا کی ہر شے کی صحیح صحیح قدر (Value) متعین کرتا ہے اور جب اقدار متعین ہو جائیں تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کس بات میں میرا نفع ہے اور کس میں نقصان۔ کونسی قدر زیادہ قیمتی ہے اور کونسی کم۔

خواہش سے عمل تک

ان بُنیادی تصورات کے ساتھ' دین وہ عملی نظام عطا کرتا ہے جس میں یہ نظری اقدار' حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہیں اور ان کے محسوس نتائج سے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے کس قدر فائدہ ہوتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر نقصان۔ اس سے اس کے جذبات و احساسات متأثر ہو کر اپنی کارفرمائی کے لئے صحیح راستہ (Channel) اختیار کر لیتے ہیں' اور چونکہ عمل کے لئے قوتِ متحرکہ انسانی جذبات ہیں' اس لئے اس کی زندگی ان بلند اقدار سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام کیریکٹر کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ یاد رکھئے۔ انسانی سعی و عمل تین مراحل میں سے گزرتی ہے۔ آپ کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش (Desire) غیر شعوری طور پر دل میں بیدار ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ کے پاس کوئی دلیل و برہان یا وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق

خالص جذبات سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ اسے عقل کے سامنے لاتے ہیں۔ اگر آپ کے جذبات شدید ہیں تو آپ کی عقل' اس خواہش کے بروئے کار لانے کے سامان سوچتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بہم پہنچاتی ہے۔ انہیں (Justificatory Reasons) کہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کی عقل' جذبات پر غالب ہوتی ہے تو وہ پھر نفع اور نقصان کا موازنہ کرتی ہے اور اگر دیکھتی ہے نفع کا پہلو زیادہ وزنی ہے تو اس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب آپ کی خواہش (Desire) آپ کی مرضی (Wish) میں بدل جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ کی قوت اِرادی آگے بڑھتی ہے اور اس خواہش کے پورا کرنے کے لئے عملی قدم اُٹھاتی ہے۔ اس مرحلہ میں آپ کی (Wish) ارادہ (Will) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

لیکن عقلِ انسانی' اگر وہ جذبات کے تابع نہ بھی ہو' تو بھی زیادہ سے زیادہ اس شخص کے ذاتی نفع یا نقصان کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس خواہش کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ بالفاظِ دیگر' انسانی عقل' فرد متعلّقہ کو یہ بتا سکتی ہے کہ کونسی بات میں اس کا فائدہ ہے اور کون سی بات میں نقصان۔ وہ حق اور باطل (Good and Evil) میں تمیز نہیں کر سکتی۔ یہ تمیز صرف اقدار کے سامنے ہونے سے ہو سکتی ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' اقدار کا تعیّن' تصوّرِ حیات کی رُو سے ہوتا ہے۔

تصوّرِ حیات کا اثر تصوّرِ حیات (صحیح یا غلط) کس طرح انسانی نگاہ کا زاویہ بدل دیتا ہے اور اس کی سعی و عمل (Activities) کا رُخ متعیّن کر دیتا ہے' اسے سمجھنے کے لئے ہمیں کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ آج ہر شخص کو شکایت ہے کہ دنیا میں جھوٹ۔ فریب۔ مکّاری۔ دغا بازی۔ بددیانتی۔ رشوت ستانی۔ بے انصافی۔ ظلم' استبداد۔ سلب و نہب (Exploitation) عام ہو رہے ہیں' ایسا نظر آتا ہے گویا ان خرابیوں کے جراثیم وبائی امراض کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں جن سے نہ کوئی خطّہ زمین محفوظ رہا ہے اور نہ اس خطّہ میں بسنے والا کوئی فرد ان سے مامون۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی بالآخر وجہ کیا ہے؟ برائیاں تو دنیا میں پہلے بھی تھیں لیکن وہ اس طرح عام اور ہمہ گیر نہیں تھیں۔ بادنیٰ تعمّق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس کی وجہ وہ تصوّرِ حیات (Concept of Life) ہے جو اُنیسویں صدی میں سرزمینِ مغرب میں نمودار ہوا اور وسائلِ رسل و رسائل کے عام اور عالمگیر ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیل گیا۔ یہ تمام خرابیاں اس ایک تصوّرِ حیات کے برگ و بار ہیں۔ یہ تصوّرِ حیات یہ تھا کہ انسانی زندگی صرف اس کی طبیعی زندگی (Physical Life) ہے اور اس کی زندگی پر انہی قوانین و ضوابط کا اطلاق ہوتا ہے۔ جن کے مطابق باقی حیوانات جیتے اور مرتے ہیں۔ بقائے اصلح (Survival of The Fittest) فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس قانون کی رُو سے' زندہ رہنے کا اسی کو حق ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کر لے۔ یہ قوت کس طریق سے فراہم

کی جائے' اس کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ضعیف اور کمزور' صرف طاقتوروں کی خوراک بننے کے لئے زندہ رکھے جا سکتے ہیں۔ ہر بڑی مچھلی' چھوٹی مچھلی کو نگل لیتی ہے۔ کیڑے مکوڑے اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ چڑیوں کی غذا کا کام دیں اور چڑیاں اس لئے جیتی ہیں کہ وہ عقاب کا شکار بنیں۔ یہی قانونِ فطرت ہے۔ یہی آئینِ حیات ہے۔ اسی سے افراد اور اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس' تقاضائے عدل ہے۔ جنگل کا بادشاہ شیر ہے۔ بکری نہیں۔ اگر شیر بکری کو کھا جاتا ہے تو اس سے بکری یہ شکایت نہیں کر سکتی کہ اس پر ظلم ہوتا ہے۔

حیوانات کی زندگی' جبلی تقاضوں (Instincts) کے زور پر بسر ہوتی ہے۔ یوں تو یہ تقاضے بہت سے ہیں' لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جذبۂ تحفّظِ خویش (Self-Preservation) جذبۂ تغلّب (Self-Assertion) اور جذبۂ افزائشِ نسل (Self-Reproduction) جب انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہر فرد' اِنہی جذبات کے تابع مصروفِ عمل رہے گا۔ اس میں اخلاقی اقدار کی گنجائش ہی نہیں ہو گی۔

نیشنلزم اس تصوّر کی بُنیادوں پر اُٹھی ہوئی تہذیب کی رَو سے' بلند ترین کیریکٹر' نیشنل کیریکٹر قرار پائے گا۔ غور سے دیکھئے تو نیشنل کیریکٹر بھی حیوانی جذبہ (Animal Instict) ہی کا پیدا کردہ ہے۔ (Herd Instinct) حیوانات کی جبلّت میں ہے۔ ہر حیوان اپنی حفاظت اسی میں دیکھتا ہے کہ وہ گلّہ کے ساتھ رہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس سے آج کل نیشن وجود میں آتی ہے اور قائم رہتی ہے۔ اپنی قوم کی بہبودی اور خوش حالی' افراد کے نزدیک بلند ترین قدر قرار پاتی ہے۔ سب سے بڑا مُحبِّ وطن وہ ہے جو دوسری اقوام کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر اس کی رنگینی سے اپنی قوم کے قصرِ بلند کی تزئین و آرائش کا سامان بہم پہنچائے۔ اس کے لئے دیانت اور بد دیانتی۔ جھوٹ اور سچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص ان اقدار کا خیال کرنے بیٹھ جائے وہ امورِ مملکت کو سرانجام ہی نہیں دے سکتا۔ (Walpole) کے الفاظ میں :-

> نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک بعض اوقات جانا ضروری ہو جاتا ہے' نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔

اس ضمن میں ان محبّانِ وطن (Patriots) کو جو کچھ کرنا پڑتا ہے' اس کے متعلّق اٹلی کے مشہور مدبّر (Cavour) کے یہ چند الفاظ دہرا دینے کافی ہیں جس میں اس نے کہا ہے کہ :-

> اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم مملکت کے لئے کرتے ہیں تو کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایک تصوّرِ حیات کے بدل جانے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کس طرح بدل جاتی ہے اور اس تصوّرِ حیات کا اثر کس طرح اس کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے کو متأثر کر دیتا ہے؟ یہ جو ابھی تک اخلاقی اقدار کی زبانی تعریف ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے تحت الشعور کو اتنی جلدی ماضی کے اثرات سے آزاد نہیں کرا سکتا۔ اگر یہ تصوّرِ حیات دو چار نسلوں تک اور آگے بڑھا تو اس کے ذہن سے ان اقدار کا تصوّر تک مٹ جائے گا اور پھر ان کا زبانی اعتراف بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس کے آثار ابھی سے نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہماری اُبھرنے والی نسل ان اقدار کو دقیانوسیت قرار دے کر ان کا مذاق اُڑاتی ہے۔

اسلام وہ تصوّرات دیتا ہے جن پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے اور اس کا ہر گوشہ بلند انسانی اقدار کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہ تصوّرات' لا مذہبیت میں تو ایک طرف' دنیا کے کسی مذہب میں بھی نہیں ملتے۔ یہی اسلام کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بناء پر وہی اور صرف وہی دین الحق قرار پاتا اور انسانی فوزو فلاح کا ضامن بنتا ہے۔ اصولی طور پر یہ تصوّرات' حسب ذیل عنوانات سے متعلق ہیں۔

(1) خدا کا تصوّر
(2) خدا اور انسان کا تعلّق
(3) انسان اور کائنات کا تعلّق
(4) انسان اور انسان کا باہمی تعلّق
(5) اعمال اور ان کے نتائج کا تعلّق
(6) زندگی کے منتہیٰ و مقصود کا تصوّر

آئندہ صفحات میں انہی تصوّرات کے متعلّق مختصر الفاظ میں بحث کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ دیگر بڑے بڑے مذاہب (ہندومت_ یہودیت۔ عیسائیت) میں یہ تصوّرات کس قسم کے ہیں اور قرآن کس قسم کے تصوّرات پیش کرتا ہے اور ان تصوّرات کی رُو سے انسانی زندگی کا نقشہ کس قسم کا مرتّب ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت میرے پیشِ نظر' مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ (Comparative Study of Religions) نہیں۔ ان مذاہب میں' ان تصوّرات کے متعلّق جو بنیادی عقائد ملتے ہیں' میں صرف انہی پر اکتفا کروں گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ حضرات انبیاءِ کرامؑ کو خدا کی طرف سے اپنے اپنے وقت میں' صحیح اور سچی تعلیم ملتی رہی تھی لیکن اہلِ مذاہب کی مروّجہ آسمانی کتابوں میں وہ تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی۔ اس لئے ان تصوّرات کے متعلّق جو کچھ کہا جائے گا وہ ان مذاہب کی موجودہ تعلیم پر مبنی ہو گا۔ ان کی اس

اصلی اور حقیقی تعلیم پر نہیں جو اس وقت ان میں سے کسی کے پاس بھی موجود نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب 'معراجِ انسانیت' کے پہلے باب میں ملے گی جس میں' خود ان مذاہب کے متبعین کی تحقیقات کے مطابق یہ بتایا گیا ہے کہ ان مذاہب کی اصلی تعلیم ان کے ہاں کہیں باقی نہیں رہی۔ لیکن چونکہ یہ حضرات اپنی موجودہ تعلیم کو اپنے مذہب کی بنیاد قرار دیتے ہیں اس لئے ان تصوّرات کے متعلّق ان کی اسی تعلیم کو سامنے لیا جائے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسری شکل ہو بھی نہیں سکتی۔

---

(1) خدا کا تصوّر

هندومت میں خدا کا تصوّر ان ہر سہ مذاہب (ہندو مت۔ یہودیت اور عیسائیت) میں ہندو دھرم کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ اس کی قدامت کا ثبوت ان کی مروّجہ مذہبی کتابیں بہم پہنچا رہی ہیں جن کا ایک ایک ورق اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ اس زمانے کی تصنیف ہیں جب ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا۔ بچپن کا ذہن' کسی مجرّد حقیقت (Abstract Reality) کا تصوّر' محسوس پیکروں سے الگ ہٹ کر' کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اس زمانے کا انسانی ذہن' خدا کی ذات کے متعلّق منزہ تصوّر کیسے قائم کر سکتا تھا۔ اس نے خدا کو اپنی شکل پر ڈھالا اس فرق کے ساتھ کہ انسان کے (مثلاً) دو ہاتھ ہیں تو خدا کے آٹھ ہاتھ سمجھ لئے۔ انسان کا ایک سر ہے' خدا کے دس سر تصور کر لئے۔ انسان پیالہ پانی پی سکتا ہے' خدا پورا سمندر اپنے اندر اُنڈیل سکتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں تین بنیادی خدا مانے جاتے ہیں۔ برہما۔ شوجی اور وِشنو۔ ان کی بیویاں بھی ہیں اور بچے بھی۔ شیو جی کی بیوی پار بتی اور ان کا بیٹا گنیش' جس کا جسم انسان کا اور سر ہاتھی کا ہے۔ برہما کی بیٹی سرسوتی۔ پہلے ان تینوں خداؤں کی پرستش ہوتی تھی لیکن اب برہما کی پرستش نہیں ہوتی۔ پرانوں میں ہے کہ ایک دفعہ شو جی نے دیکھا کہ برہما اپنی لڑکی سرسوتی سے فعلِ شنیع کا مرتکب ہونا چاہتا ہے اس لئے اس نے اس کی پرستش بند کر دی۔ (ہندو ازم صفحہ 184 مصنفہ گووند داس)

تخلیقِ کائنات کے متعلّق' شوپران میں حسب ذیل بیان ملتا ہے۔

> شو جی نے خواہش کی کہ میں دنیا کو پیدا کروں۔ اس نے برہما کو پیدا کیا۔ برہما نے ایک چُلّو پانی اُٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ اس سے ایک بُلبلا اُٹھا۔ بلبلے میں سے ایک آدمی پیدا ہوا۔ اس نے برہما سے کہا کہ "اے بیٹے دنیا کو بنا"۔ برہما نے کہا "میں تیرا بیٹا نہیں۔ تو میرا بیٹا ہے۔ دونوں میں جھگڑا برپا ہوا۔ مہا دیو (شو جی) نے سوچا کہ جن کو میں نے دنیا بنانے کے

لئے بھیجا تھا وہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ تب ان دونوں کے بیچ میں سے ایک نُورانی لنگ پیدا ہوا وہ فوراً آسمان میں چلا گیا۔ اس کو دیکھ کر دونوں حیران ہو گئے۔

اس کے بعد سنئے کیا ہوا۔

دونوں سوچنے لگے کہ اس لنگ کا شروع اور آخر معلوم کرنا چاہئے۔ جو پہلے آئے وہ باپ جو پیچھے آئے وہ بیٹا کہلائے۔ وِشنو کچھوے کی شکل بنا کر لنگ کا پتہ لگانے کے لئے نیچے کو چلا۔ برہما ہنس کا جسم بنا کر اُوپر کو اڑا۔ دو ہزار برس دونوں من کی سی تیز رفتار سے چلتے رہے مگر لنگ کی حد نہ ملی۔ برہما نے سوچا اگر وشنو پتہ لے آیا ہو گا تو مجھے اس کا بیٹا بننا پڑے گا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس وقت ایک گائے اور کیتکی کا درخت اُوپر سے اُترا۔ برہما نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہزاروں برس سے اس لنگ کے سہارے چلتے آئے ہیں۔ برہما نے پوچھا کہ اس لنگ کی کوئی حد ہے یا نہیں۔ انہوں نے کہا نہیں۔ برہما نے کہا کہ میرے ساتھ چل کر اس کی گواہی دو کہ گائے اس لنگ کے سر پر دُودھ کی دھار بہاتی تھی اور درخت کہے کہ میں پھول برساتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جُھوٹی گواہی نہیں دیں گے۔ تب برہما خفا ہو کر بولا کہ گواہی نہیں دو گے تو میں تمہیں ابھی خاکستر کر دوں گا۔ تب دونوں نے ڈر کر کہا کہ جیسے تم کہو ویسی ہی گواہی دے دیں گے۔ تب تینوں نیچے کی طرف چلے۔

برہما نے وشنو سے پوچھا کہ تم نے اس لنگ کی حد معلوم کی یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ برہما نے کہا کہ میں پتہ لے آیا ہوں۔ وشنو نے کہا کہ گواہی دو۔ تب گائے اور درخت نے جُھوٹی گواہی دی۔ اس پر لنگ نے کیتکی کو بددعا دی کہ تو نے جُھوٹ بولا ہے۔ تیرا پھول مجھ پر یا کسی دیوتا پر کبھی نہیں چڑھے گا۔ جو کوئی چڑھائے گا اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ گائے کو بددعا دی کہ جس منہ سے تو نے جھوٹ بولا ہے اس منہ سے تو پاخانہ کھایا کرے گی۔ تیرے منہ کی پرستش کوئی نہیں کرے گا لیکن دُم کی کریں گے۔ برہما کو بددعا دی کہ تو نے جُھوٹ بولا ہے اس لئے تیری پرستش دنیا میں کبھی نہیں ہو گی۔ وشنو کو دعا دی کہ تو نے سچ بولا ہے اس لئے تیری پرستش سب جگہ ہو گی۔ پھر دونوں نے لنگ کی حمد و ثنا کی۔

اس حمد و ثنا کو سن کر لنگ میں سے ایک جٹا جوٹ صورت نکل آئی اور کہنے لگی کہ میں نے تم کو خلقت پیدا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ تم جھگڑے میں کیوں پڑ گئے۔ تب مہادیو نے بالوں میں سے ایک راکھ کا گولا نکالا اور کہا۔ جا کر اس سے خلقت پیدا کرو۔

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش۔ سوامی دیانند۔ صفحہ (272-273))

خدا کا تصوّر وہ بلند ترین آئیڈیل ہوتا ہے جسے کوئی قوم اپنی سامنے رکھتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے

سامنے خدا کا یہ تصوّر ہو اس کے اعمالِ حیات کس قسم کے ہو سکتے ہیں۔ نہ اس قوم کا ذہن توہم پرستی سے نجات حاصل کر سکتا ہے' نہ ان کے اعمال کا مدار علم و بصیرت قرار پا سکتا ہے۔ وہ جس خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں وہ بھی انسانی پیکر سے بلند نہیں ہوتا۔ چنانچہ اتھروید میں ہے کہ خدا کی پوجا پاٹ کے وقت یہ کہنا چاہئے کہ

اے جیئوں کے سوامی پرماتما! تیرے مکھ (منہ) کو نمسکار (سجدہ) ہے۔ تیری آنکھوں کو نمسکار ہے۔ تیری چمڑی کو نمسکار ہے۔ تیرے انگوں (اعضاء) کو نمسکار ہے۔ تیرے پیٹ کو نمسکار ہے۔ تیری جیبھ (زبان) کو نمسکار ہے۔ تیرے مکھ (چہرے) کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کی گندھ (بو) کو نمسکار ہے۔

یہودیوں کے ہاں خدا کا تصوّر ہندو مت کے بعد' اب یہودیت کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ وہاں خدا کا تصوّر کس قسم کا ملتا ہے۔ غالباً لاک (Locke) نے کہا تھا کہ تم مجھے بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا تھا اور میں یہ بتا دوں گا کہ اس قوم کی تہذیب اور اس کا تمدّن کس قسم کا تھا۔ مروّجہ تورات کے مطالعہ سے خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے' اس کے متعلق ایک مغربی محقق کا پیش کردہ جائزہ سامنے لے آنا کافی ہو گا۔ (Joseph Whebs) اپنی کتاب (Is It God's) میں لکھتا ہے۔

تورات کا خدا بے شمار قاتلوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور' غدّار' انتقام کے جذبے میں ایک خونخوار عفریت' گنہگار اور بے گناہ دونوں کو بے رحمی سے سزا دینے والا۔ نہایت مہیب اور خوفناک۔ ظلم اور تعصب کا مجسّمہ۔ متکبّر۔ شیخی باز۔ وعدہ خلاف۔ غلط بیان اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے والا۔

(بحوالہ معراجِ انسانیت صفحہ 22)

تورات میں ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ اب ظاہر ہے کہ جس خدا کی اس قسم کی شکل ہو' اس کی پیدا کردہ قوم کی شکل بھی ایسی ہی ہو گی۔ یہ خدا کی شکل نہیں بلکہ اس قوم کی اپنی سیرت کا بیان ہے۔ خدا کے اس قسم کے تصوّر کے بعد' اخلاقی اقدار کا جو حشر ہو سکتا ہے اس کے لئے کسی صراحت اور وضاحت کی ضرورت نہیں۔

عیسائیت میں خدا کا تصوّر یہودیت سے آگے بڑھ کر عیسائیت کی طرف آیئے تو وہاں خدا کے تصوّر

کی چیستاں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ کونسل اوف ٹرنٹ نے عیسائیت کے بنیادی عقیدہ کے لئے جو نظریہ تجویز کیا تھا اور جس کے اقرار سے ایک شخص عیسائی بنتا ہے' حسب ذیل ہے۔

ہم ایمان لائے (1) خدا' قدرت والے باپ پر جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے۔ اور ہم ایمان لائے (2) ربِ یسوع ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ یعنی خدا کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے۔ عین خدا ہے۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے۔ اس کی وساطت سے تخلیقِ اشیاء ظہور میں آئی ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول وحلول ہوا۔ وہ انسان بن کر آیا۔ مبتلائے مصیبت ہوا۔ اور تیسرے دن اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور آسمان پر چڑھا۔ اور اب زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے کے لئے پھر دنیا میں آئے گا۔

یہ تو رہا حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا عقیدہ۔ ان کی والدہ ماجدہ' حضرت مریمؑ کے متعلق مقدّس کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ

وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالکہ ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے سرچشمۂ خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے' اس لئے وہ ہماری سفارش سے انکار نہیں کر سکتی..... ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس سے کرتے ہیں وہ مستجاب ہوتی ہیں۔

(بحوالہ شعلۂ مستور صفحہ 129 (Catholic School Book. P.158)

چنانچہ اب حال ہی میں' پوپ کی مجلس نے فیصلہ کیا ہے کہ باپ۔ بیٹا اور روح القدس کے ساتھ حضرت مریمؑ کی بھی پرستش کی جایا کرے۔

قرآن کا دیا ہوا تصوّر خدا کے ان تصوّرات کے بعد اب قرآنِ کریم کی طرف آیئے۔ اس نے سب سے پہلے ان تمام تصوّرات کی یہ کہہ کر تردید کر دی کہ **سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ** (23/92)۔ یہ لوگ خدا کے متعلق جو تصوّرات اپنے ذہن سے پیش کرتے ہیں' وہ ان سے بلند اور پاک ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلّق ہے تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ تم انہی چیزوں کا ادراک کر سکتے ہو جو محسوسات کے دائرے میں آسکیں اور خدا کی ذات اس سے ماوراء ہے۔ لہٰذا **لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ** (6/104)۔ انسانی نگاہیں اس کا

نہیں کر سکتیں۔ وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ وہ بہت لطیف و خبیر ہے۔ اس کی ذات کو کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اس لئے کہ **لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ** (42/11)۔ اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ **لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ** (112/3)۔ نہ وہ خود کسی کا بیٹا۔ نہ کوئی اس کا بیٹا۔ **وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ** (112/4)۔ نہ کوئی اس کا ہمسر۔ وہ یکسر یگانہ اور بے مثل و بے نظیر ہے۔

اس کی ذات کے متعلق تو تم کچھ نہیں جان سکتے۔ البتہ اس نے جو اپنی صفات بیان کی ہیں ان سے خدا کا جو تصوّر سامنے آتا ہے اس سے بلند' پاکیزہ' باعظمت اور حسین تصوّر ہو ہی نہیں سکتا۔

(2) خدا اور انسان کا تعلّق

سوال یہ ہے کہ خدا کی ان صفات پر ایمان لانے سے فائدہ کیا ہے۔ ایک شخص تسلیم کرتا ہے کہ خدا کی یہ صفات ہیں۔ دوسرا اس سے انکار کرتا ہے۔ اس اقرار اور اس انکار سے ان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی پیکر "روحِ خداوندی" کا حامل ہے۔ جسے انسانی ذات (Human Personality) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات میں اس کا امکان رکھ دیا گیا ہے کہ وہ (علیٰ حدِّ بشریت) ان خدائی صفات کو اپنے اندر اُجاگر کرتی جائے۔ یہی وہ خدا کا رنگ ہے جس سے حسین تر رنگ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ **صبغة الله ومن احسن من الله صبغة** (2/138)

اس اعتبار سے' خدا کی یہ صفات' انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک خارجی معیار (Objective Standard) کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ یہ وہ (Ideal) ہے جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ وہ معیار ہے جس پر وہ پورا اُترنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس خارجی معیار پر ہر آن اپنے آپ کو ناپتا جاتا ہے اور اس طرح علیٰ وجہ البصیرت پرکھتا جاتا ہے کہ اس کی ذات کی کس حد تک نشوونما (Development) ہوئی ہے۔ اور اس میں ہنوز کیا کمی ہے۔

اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ کس موقع پر خدا کی کونسی صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ تاکہ ایسے موقع پر انسان کی طرف سے بھی اسی قسم کی صفت کا ظہور ہو۔ اس سے یہ متعیّن ہوتا ہے کہ خارجی واقعات و حوادث پر انسان کا ردِّعمل کیا ہونا چاہئے۔ یاد رکھئے۔ جس طرح انسان کے لئے صفاتِ حسنہ کا حامل ہونا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی واقعہ پر انسان کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو جو اس کے لئے مناسب اور موزوں (Appropriate) ہو۔ شقی القلب ظالم پر' جس کے دل میں نہ احساسِ ندامت ہو نہ آرزوئے اصلاح' ترس کھا کر اسے کھُلا چھوڑ دینا' مظلوم انسانوں پر بے انتہا ظلم ہے۔ لیکن جہاں عفو اور در گذر سے خوشگوار نتائج متوقع ہوں وہاں بدلہ لینا ظلم کے مرادف ہو جاتا ہے۔ عضلات (Muscles) کی چوٹ آہستہ آہستہ مالش سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ لیکن ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو سخت لکڑی کی

تختیوں (Splints) سے کس کر باندھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے جبّاریت کہتے ہیں (جرّاح کی ان لکڑیوں کو جبائر کہتے ہیں) قرآنِ کریم ان صفاتِ خداوندی اور ان کے مواقع ظہور و اطلاق کو بڑی شرح و بسط سے بیان کرتا ہے تاکہ وہ جہاں ایک فرد کی ذات کی نشوونما کا معیار بنیں' وہاں یہ بھی بتائیں کہ انسان کی طرف سے کس موقع پر کس قسم کا ردِّعمل ہونا چاہیئے۔

قانون کا خدا اسی سے ایک اور اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ مذہب میں خدا کا تصوّر ایک مستبد بادشاہ (Autocrate King) اور مطلق العنان آمر (Dictator) کا ہوتا ہے' جس کے تمام فیصلے اس کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں اور ان میں کسی قاعدے اور قانون کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ خوش ہو گیا تو مجرم کو خلعت بخش دی۔ ناراض ہو گیا تو بے گناہ کو حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ انسان کی خیریت اسی میں ہے کہ جس طرح ہو سکے اس "خدا" کو خوش رکھے۔ وہ اس کی خوشنودئ مزاج حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتا ہے۔ اس کے حضور نذرانے گزارتا ہے۔ اس کے مقرّبین کے وسیلے حاصل کرتا ہے۔ ان احکام کی فرماں برداری سے انسان کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سے مقصود صرف "خدا" کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف' عیسائیت ہے۔ جہاں خدا کا تصوّر ایک رقیق القلب باپ کا ہے' وہاں بھی قاعدے اور قانون کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں نجات کا مدار خدا کے رحم پر ہے۔

قرآن نے آکر اس تصوّر کی بھی تردید کی اور کہا کہ خدا نے' اپنی لا محدود قوتوں اور بے انتہا اختیارات کے باوجود' ہر کام کے لئے قاعدے اور قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور وہ سب کچھ ان قوانین کے مطابق کرتا ہے۔ یہ قوانین اس قدر اٹل ہیں کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ **فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا** (35/43)۔ قانون کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ہر بات (Cause and Effect) علّت اور معلول کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے۔ یعنی اگر فلاں کام کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اگر اس کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کا انجام یہ ہو گا۔ اس نے انسان کو یہ تمام قوانین بتا دیئے۔ اچھی طرح سمجھا دیئے۔ اس پر واضح کر دیا کہ اس قانون پر عمل کرنے سے اس کا یہ فائدہ ہو گا اور اس کی خلاف ورزی سے اس کا یہ نقصان ہو گا۔ یہ سب کچھ بتا دینے کے بعد اس سے کہہ دیا کہ اب تمہارا جی چاہے تو یہ راستہ اختیار کر لو اور جی چاہے تو اس کے خلاف چلے جاؤ۔ **اِنَّا ھَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا** (76/3)۔ "ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے۔ اب وہ چاہے اسے اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے"۔ وہ صحیح راستہ اختیار کر لے گا تو اس سے اسی کا فائدہ ہو گا۔ ہمارا کچھ نہیں سنورے گا۔ غلط راستے پر چلے گا' تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ ہمارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ **لَھَا مَا کَسَبَتۡ وَعَلَیۡھَا مَا**

ہے کہ خدا کسی بات کو "حکماً" اور جبراً" نہیں منواتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے
كْتَسَبَتْ (2/286)۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کسی بات کو "حکماً" اور جبراً" نہیں منواتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے
مشورۃ" کہتا ہے۔ اس نے قرآن نازل کرنے کے بعد کہہ دیا کہ **قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ فَمَنْ شَآءَ**
فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18/29)۔ ان سے کہدو کہ حق تمہارے ربّ کی طرف سے آگیا۔ اب جس
کا جی چاہے اسے مان لے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ ظاہر ہے کہ جس بات کے ماننے' نہ
ماننے کا فیصلہ انسان پر چھوڑ دیا گیا ہو' اگر وہ صاحبِ عقل و ہوش ہے تو وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے گا۔ لہٰذا'
قرآن کی رُو سے ایمان' اندھے یقین (Blind Faith) کا نام نہیں۔ یہ اس ذہنی اور قلبی اطمینان
(Conviction) کا نام ہے جو انسان کو علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مومنین کی
خصوصیت یہ بتائی ہے کہ **اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا** (25/73)؛
یہ وہ لوگ ہیں کہ جب (اور تو اور) خود اُن کے ربّ کی آیات بھی اِن کے سامنے لائی جاتی ہیں تو وہ ان
پر بہرے گونگے بن کر نہیں گر پڑتے۔ انہیں عقل و بصیرت سے قبول کرتے ہیں۔
یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اعمال کے نتائج' قاعدے اور قانون کے مطابق مرتّب ہوتے ہوں' تو اس میں
کسی کے فدیہ دے کر چھوٹ جانے یا سفارش سے رہا ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی اُنگلی
آگ میں ڈال لیں اور اس کے بعد ہزار روپیہ دیکر بھی چاہیں کہ جلنے کا درد آپ کی جگہ کسی اور کو ہو جائے
تو یہ ناممکن ہو گا۔ اگر آپ سنکھیا کھا لیں تو چاہے آپ گورنر جنرل کی سفارش بھی کیوں نہ لے آئیں' آپ
اس کے مضر اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ خدا کے اس قانون
کی طرف رجوع کریں جس کے مطابق' جلنے کے درد کو آرام اور سنکھیا کے مہلک اثرات سے حفاظت مل
سکتی ہے۔ انسان کو تکلیف اور راحت' اس کے اعمال کے نتائج میں' خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے
لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (8/42)۔ تاکہ جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی دلیل
و بُرہان کی رُو سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے۔ نہ کوئی بے گناہ
مستبد حاکم کے غصّے اور جذبہ انتقام سے سزا پاتا ہے اور نہ ہی مجرم' فدیہ' کفارہ یا سفارش سے چھوٹ سکتا ہے۔
اسی لئے انسانوں سے کہہ دیا گیا ہے کہ **وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ**
مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (2/48)۔ ظہورِ نتائج کے وقت کوئی شخص کسی
دوسرے کے کام نہیں آسکے گا' نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی' نہ ہی کوئی معاوضہ دے کر چھوٹ
سکے گا' نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا۔
آپ نے غور کیا کہ "قانون والے خدا" کا تصوّر دے کر' قرآنِ کریم نے کس طرح مذہب کو سائنس بنا

دیا؟ سائنس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس میں

(1) ہر سبب (Cause) اپنا ایک مقرّرہ نتیجہ (Effect) پیدا کرتا ہے اور اس میں کوئی تغیّر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اور

(2) سائنس' انکشافِ حقیقت اس طرح کرتی ہے کہ اس پر کسی شخص کی خواہش' آرزو' مقصد' مفاد' جذبات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ ان باتوں سے ذرا بھی متأثر نہیں ہوتی۔

خدا کا جو تصوّر قرآن پیش کرتا ہے' اس کی رُو سے اعمال اپنے نتائج بھی اسی طریق سے مرتّب کرتے ہیں اور حقائق کا اظہار بھی اسی طرح کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ہمارا یہ پیغام "شاعری" نہیں۔ کالرج (Coleridge) نے ایک جگہ کہا ہے کہ شاعری کی ضد' نثر نہیں۔ سائنس ہے۔ (The Anti_Thesis of Poetry is not Prose But Science) قرآن' شاعری نہیں' سائنس ہے۔

خدا اور انسان کے تعلّق کے سلسلہ میں' قرآنِ کریم ایک اور عظیم حقیقت کی پردہ کُشائی کرتا ہے۔ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین از خود جاری و ساری ہیں۔ ان کے مطابق' ہر شے اپنے اپنے فریضہ کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہتی ہے اور کائنات اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھی چلی جا رہی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی خدا کے قوانین اسی طرح نافذالعمل ہیں لیکن ان کی کائناتی رفتار بڑی سست ہے اور انسانی عمر کا تقاضا ہے کہ اعمال کے نتائج جلد سامنے آجائیں۔ اگر انسانی دست و بازو' قوانینِ خداوندی کو سہارا دیں اور ان کے بروئے کار آنے میں مدد کا موجب بنیں' تو ان کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق مرتّب ہو سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے' انسان' مشیّت کے پروگرام کی تکمیل میں' خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ خدا اور انسان کا یہ وہ تعلّق ہے جس کے متعلّق "مذاہب کی دنیا" میں کہیں اشارہ تک نہیں ملتا۔ (چونکہ اس نکتہ کے متعلق' میں اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی)۔

3- انسان اور کائنات کا تعلّق

خدا اور انسان کے تعلّق کے بعد' انسان اور کائنات کے باہمی تعلّق کا سوال سامنے آتا ہے۔ جب ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو فطرت کی قوتوں کا راز اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ ان سے ڈرتا تھا اور ان کے غضب سے بچنے کا ایک ہی طریقہ اس کے ذہن میں آسکتا تھا۔ یعنی ان کے سامنے گڑگڑایا جائے

ور ان سے رحم کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ اُس دور کے انسان کی حالت یہ تھی کہ بادل گرجا اور اس نے ہتھ جوڑ دیئے۔ بجلی کڑکی' اور یہ سجدے میں گر گیا۔ سورج چمکا اور اس نے اسے نمسکار کر دیا۔ زلزلہ آیا اور یہ ڈنڈوت بجا لایا۔ بپھرا ہوا دریا سامنے آیا اور اس نے اسے ماتا کہہ دیا۔ شیر دھاڑا اور اس نے اسے دیوتا بنا یا۔ ہندو مت انہی دیوی دیوتاؤں کا مجموعہ ہے اور انہی کی پرستش سکھاتا ہے۔ یجروید میں ہے۔

ہندو دھرم میں زمین میں رہنے والے سانپوں کو سجدہ قبول ہو۔ جو سانپ ہوا میں یا آسمان پر ہیں ان کو ہمارا سجدہ ہو۔ جو سانپ دھانوں کے تیروں کے ساتھ آتے ہیں۔ انہیں بھی سجدہ ہو۔ جو سانپ ابھی اپنے بلوں میں ہیں انہیں بھی ہمارا سجدہ قبول ہو۔

یہ تو پھر بھی زندہ قوتیں تھیں۔ وہ ان غیر ذی حیات چیزوں کو بھی سجدے کرتے تھے جن سے انہیں کسی نقصان کا اندیشہ ہوتا تھا۔ چنانچہ یجروید ہی میں دوسری جگہ ہے کہ حجامت بنواتے وقت یہ اشلوک پڑھنا چاہئے۔

اے استرے تو کلیان کاری ہے اور اچھے لوہے کا بنا ہوا ہے۔ تجھے ہمارا سجدہ قبول ہو۔ تو اس کو بالکل تکلیف نہ پہنچائیو۔

اتھروید میں ہے۔

سردی والے بخار کو ہمارا سجدہ ہو۔ گرمی والے بخار کو بھی میں سجدہ کرتا ہوں۔ روزانہ' دوسرے اور تیسرے دن آنے والے بخار کو میرا سجدہ قبول ہو۔

ظاہر ہے (جس مذہب میں انسان اپنا مقام یہ سمجھے' اس میں شرفِ انسانیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں اس نے اگر جھوٹ نہ بولو۔ سچ بولو' کہہ بھی دیا تو کیا اس سے کائنات کی گتھیاں سلجھ جائیں گی اور انسانی معاملات (Human Problems) کا حل مل جائے گا؟

عیسائیت میں یہاں سے اُتر کر دوسری طرف آیئے تو وہاں مادی کائنات اور اس کی آرائش و آسائش کی چیزوں کو یکسر قابلِ نفرت قرار دیا جاتا ہے' اور انسانی نجات کا راز ترک دنیا' ترکِ آرزو اور ترکِ لذّات میں بتایا جاتا ہے۔ جتنا کوئی دُنیا سے دُور بھاگے' اُتنا ہی وہ خدا کا مقرّب ہو جاتا ہے۔ رہبانیت اور خانقاہیت کی تعلیم' عیسائیت کی اصل و بنیاد ہے۔ (Saint Benedict) نے اسے ایک منظم ادارہ کی شکل دے کر تارک الدّنیا راہبوں (Monks) اور راہبات (Nuns) کے غول کے غول پیدا کر دیئے۔ چنانچہ (Bucks) اپنی (Theological Dictionary) میں' مصر میں تحریکِ خانقاہیت کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ:۔

تھوڑے ہی عرصہ میں تمام مشرق سہل انگار انسانوں کی جماعتوں سے بھر گیا جنہوں نے تمام دنیاوی علائق سے قطع تعلق کر کے کرب و اذیت اور مصائب و نوائب کی زندگی اختیار کر لی تاکہ اس کے ذریعے خدا اور عالمِ ملکوت سے قرب حاصل کیا جا سکے۔

اس قسم کی زندگی کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا' وہی ہؤا۔ چنانچہ (Buck) اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان لوگوں کی شہوت پرستی ضرب المثل ہو گئی۔ نیز انہوں نے مختلف مقامات پر لوگوں کو مشتعل کر کے ہنگامے اور شورشیں برپا کرنا شروع کر دیں۔

ان تارک الدّنیا زاہدوں سے ایک دنیا تنگ آ رہی تھی۔

لپٹ لپٹ کر مانگنے والے بھکاری' راہبوں کے لباس میں ہر گلی کوچے میں آوارہ پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر قسم کی بدمعاشی اور فریب دہی ان کا شعار تھا..... یہ لوگ مذہبی جوشِ عقیدت کے نقاب میں بدترین لوٹ کھسوٹ کی وارداتوں کے مرتکب ہوتے تھے۔

(Progress of Religious Ideas - Vol: 3. P.240)

جو لوگ اس قسم کی مذموم حرکات کے مرتکب نہیں ہوتے تھے' ان کی زندگی بھی عجیب و غریب انداز کی ہوتی تھی۔ عیسائیوں کے ہاں جو بڑے بڑے اولیاء (Saints) کا نام ملتا ہے ان کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی قسم کھا لیتا کہ میں عمر بھر غسل نہیں کروں گا۔ کوئی اپنے آپ کو عمر بھر دلدل میں ڈالے رکھتا۔ کوئی غلاظت کے حصار میں بیٹھے رہنے میں روحانی ترقی کا راز سمجھتا۔ کوئی ساری عمر اندھیری کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ یہ تھا عیسائیت کی ترکِ دنیا کی تعلیم کا نتیجہ۔

قرآن کریم کی رُو سے قرآن آیا اور اس نے انسان سے کہا کہ تیرا مقام' فطرت کی قوتوں سے بہت بلند ہے۔ ان سب کو ہم نے قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے تاکہ تو ان سے اپنے فائدے کے کام لے۔ (اَللّٰہُ الَّذِیْ) **سَخَّرَ لَکُمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ** (45/13)۔ اللہ وہ ہے جس نے' کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' سب تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ مقامِ آدم یہ ہے کہ تمام ملائکہ (فطرت کی قوتیں) اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اور مقام مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے انہیں نوعِ انسان کی نفع رسانیوں کے لئے صرف کرے۔ محسوس کائنات میں انسان سے اُوپر صرف مقامِ خداوندی ہے جس کے قانون کے مطابق اسے زندگی بسر کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ' انسان سے برتر کوئی شے نہیں۔ دنیا کی زیبائش و آرائش کی چیزیں انسان کے لئے بنائی گئی ہیں۔ انہیں کوئی قابلِ نفرت اور حرام قرار نہیں دے سکتا۔ **قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ**

مِنَ الرِّزْقِ (7/32)- ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے- اور خوشگوار رزق کو حرام قرار دے سکتا ہے؟

آدمی کا یہ مقام اور انسان اور کائنات کا یہ تعلّق' "دنیائے مذاہب" میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا- وہاں یا تو مظاہرِ فطرت کے سامنے جھک جانا ہو گا' یا اُن سے دُور بھاگ جانا- اُنہیں مسخر کر کے تعمیرِ انسانیت کے کاموں میں صرف کرنا' صرف قرآن میں ملے گا-

یاد رکھئے کہ قرآنِ کریم جب قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا حکم دیتا ہے تو ان میں فطرت کے طبیعی قوانین بھی شامل ہوتے ہیں اور اخلاقی قوانین بھی- طبیعی قوانین کی اطاعت سے ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیں- (We Obey Nature to Command it) اور اخلاقی قوانین کی اطاعت سے ہماری ذات کی نشوونما ہوتی ہے- دونوں صورتوں میں قوانین کی اطاعت' ہماری قوتوں میں اضافہ کا موجب بنتی ہے-

می شود از جبر پیدا اختیار

4- انسان اور انسان کا باہمی تعلّق

ہندو دھرم میں انسان اور کائنات کے تعلّق کے بعد' ہمارے سامنے انسان اور انسان کے باہمی تعلّق کا سوال آتا ہے ہندو مت نے اس کے متعلّق فیصلہ کر دیا کہ برہمن' برہما کے سر سے پیدا ہوتے' کھشتری اس کے بازوؤں سے' ویش اس کی ٹانگوں سے اور شودر اس کے پاؤں سے- یہ وہ ازلی تقسیم ہے جسے نہ دُنیا کا کوئی نظام اُلٹ سکتا ہے اور نہ ہی انسان کی ذاتی کوششیں اس میں تغیّر و تبدّل کر سکتی ہیں- شودر کو ساری عمر اچھوت رہنا ہو گا- اس کا فریضہ' اُونچی ذات کے ہندوؤں کی خدمت گزاری ہے- برہمن کے گھر پیدا ہونے والا بچہ' پیدائش کے دن سے مرتے وقت تک' بلند ترین مدارج اور حقوق کا حامل ہوتا ہے- اس کے حقوق کی کیفیت یہ ہے کہ (رگ وید اور اتھروید کے حکم کے مطابق)

> اگر کسی عورت کے پہلے دس غیر براہمن خاوند موجود ہوں، لیکن اگر براہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے کیونکہ براہمن ہی عورتوں کا مالک اور خاوند ہے- نہ کہ کھشتری یا ویش- (معراجِ انسانیت- صفحہ 81)

یہ تقسیم تھی بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کی- باقی رہے اس کے باہر کے انسان سو وہ انسان نہیں بلکہ

ملیکش سمجھے جاتے تھے۔ آپ سوچئے کہ جس مذہب میں' خود اپنے اہلِ مذہب کو اس طرح ورنوں کی نہ ٹوٹنے والی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے' اور اس سے باہر کے انسانوں کو اس درجہ قابلِ نفرت و حقارت سمجھا جائے۔ اس میں جھوٹ نہ بولو اور چوری نہ کرو کا پرچار کیا اخلاقی اصلاح پیدا کر سکتا ہے؟

یہودیت میں یہودیوں کے ہاں' مذہب بنی اسرائیل کی نسل کے اندر محدود تھا۔ کوئی شخص جو بنی اسرائیل کے ہاں پیدا نہ ہو' دینِ خداوندی کے اندر داخل کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ جنّت صرف بنی اسرائیل کے لئے مخصوص تھی۔ غیر بنی اسرائیل سب جہنّم کا ایندھن تھے۔ اپنی نسل سے باہر کے انسانوں کے خلاف ان کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات بھڑکتے رہتے تھے اور یہ سب (مروّجہ) تورات کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ ان کے ہاں' یہودیوں کے لئے قانون اور تھا اور غیر بنی اسرائیل کے لئے اور۔

عیسائیت میں عیسائیت کے متعلّق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لئے عالمگیر مذہب کی حیثیت رکھتی ہے اس میں' انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ لیکن یہ چیز' عیسائیت کی تعلیم نہیں بلکہ بعد میں سیاسی مصلحتوں کا پیدا کردہ تصوّر ہے۔ چنانچہ موجودہ انجیل میں (جو اگرچہ وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے) ابھی تک یہ لکھا ملتا ہے کہ جب حضرت یسوعؑ نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو

> انہیں حکم دیا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی۔ باب صفحہ 10 آیات 5-6)
>
> پاک چیز کتوں کو نہ دو۔ اور اپنے موتی سؤروں کے آگے نہ ڈالو۔ (متی۔ باب 7 آیت 6)

یہ جو آپ یورپ میں نیشنلزم کی لعنت کو اس درجہ شدید دیکھتے ہیں' یہ غیر شعوری طور پر' اسی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ مذہب کو تو انہوں نے گرجا کی چار دیواری کے اندر محبوس کر دیا لیکن اس کی نسل پرستی کی تعلیم کے اثرات ان کے تحت الشّعور میں اسی طرح موجود ہیں۔ ان کے سامنے عالمگیر انسانیت کا تصوّر آ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں اپنی قوم کے لئے اخلاقی اصول اور ہیں اور دوسری قوموں کے لئے اور۔ جس طرح رومنز کے ہاں یہ قانون تھا کہ کسی رومی کے ہاں چوری کرنا جرم ہے اور غیر رومی کے ہاں چوری کرنا کوئی جرم نہیں۔

قرآن کی رُو سے قرآن نے آکر' انسانوں کی ان خود ساختہ زنجیروں کو توڑا اور اعلان کر دیا کہ تمام دنیا کے انسان ایک ہی اصل کی شاخیں اور ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں۔ انسان اور انسان میں پیدائش

کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ **خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ** (4/1) خدا نے تم سب کو ایک جرثومۂ حیات (Life Cell) سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ **وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (10/19)۔ پوری کی پوری انسانیت (Mankind) ایک قوم ہے۔ اور ہر انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہے۔ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ** (17/70)۔ ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ کالے کو گورے پر۔ گورے کو کالے پر۔ عربی کو عجمی پر' عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔ یہاں نہ کوئی براہمن ہے نہ شودر۔ نہ کوئی جاتی اُتر ہے نہ نیچ۔ سب انسان یکساں ہیں۔ باقی رہے معاشرہ میں ان کے مدارج' سو اِس کا معیار اُن کے جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار پر ہے **وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا** (46/19)۔ "ہر ایک کے درجات ان کے اعمال کی رُو سے متعیّن ہوں گے"۔ اور ان میں سب سے زیادہ واجب العزّت وہ ہو گا جس کی سیرت سب سے پاکیزہ اور کردار سب سے بلند ہو گا۔ **اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ** (49/13)۔ قرآن کا خدا' تمام نوعِ انسان کا یکساں ربّ' مالک' اور الٰہ ہے **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ** (114/1-3)۔ اس خدا کی کتاب **بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ** (45/21)۔ تمام نوع انسان کے لئے مجموعۂ بصائر و حکم۔ اس کا رسول' تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں رسول۔ **قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا** (7/158)۔ "ان سے کہہ دو کہ اے تمام دنیا کے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں"۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ کہ دنیا میں ثبات و دوام صرف اسی نظریہ یا عمل کو حاصل ہو سکا ہے' جو بلا تفریقِ رنگ' نسل' زبان' وطن' مذہب' قومیت' تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہے **وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ** (13/17)۔ "زمین میں باقی وہی رہتا ہے جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو" جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے' مغربی تصوّرِ حیات نے بقائے اصلح (Survival of The Fittest) کا اصول دیا۔ یعنی باقی وہی رہ سکتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ قرآن نے اس کی بجائے "بقائے انفع" کا اصول دیا یعنی باقی وہ رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ آپ نے غور کیا کہ اس ایک تصوّرِ حیات کے بدل جانے سے' انسانی زندگی کے تمام گوشے کس طرح بدل جاتے ہیں اور اس سے دنیائے انسانیت میں کس قدر حیات افروز اور حسن افزا تبدیلی آجاتی ہے؟ یہی وہ تصوّرِ حیات ہے جس سے انسان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ میں دوسروں کی بہتری کے لئے کیوں کوشش کروں؟ حیاتِ دوام حاصل کرنا' ہر انسان کی دلی خواہش ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے کام کرو جو عالمِ انسانیت کے لئے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش ہوں۔ دوسرے کی ضرورت شدید ہو' تو اسے اپنے آپ

پر ترجیح دو۔ **يُؤْثِرُونَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ** (59/9)۔ مومن وہ ہیں جو خود تنگی میں رہتے ہیں اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں)۔ اور یہ سب کچھ بغیر کسی ذاتی غرض کے خیال سے کرو۔ وہ کہتا ہے کہ مومن جب دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76/9)۔ ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ تم سے شکریہ تک بھی نہیں چاہتے۔

سوچئے کہ اس تصوّرِ حیات کی رُو سے' اخلاقی اقدار کس طرح زندگی کا معمول بن جاتی ہیں!

انسانی مساوات کے تصوّر کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجاتا ہے جس میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کا غلام ہونا تو ایک طرف' کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی کا محتاج۔ اس سے ایک ایسا نظام قائم ہوتا ہے جس میں تمام افراد' قوانینِ خُداوندی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں۔ **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (42/38)۔

قرآنی نظام یہ نظام ہر فرد کو اس کی ضمانت (گارنٹی) دیتا ہے کہ **نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ** (6/152)۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی"۔ کہئے !! اس نظام میں کسی کو جھوٹ بولنے یا چوری اور بددیانتی کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ اس میں اخلاقی اقدار خود بخود بروئے کار آتی چلی جاتی ہیں۔ اس نظام میں نہ کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) حاصل ہوتے ہیں۔ نہ مذہبی پیشواؤں کا وجود باقی رہتا ہے۔ نہ ملوکیت نظر آسکتی ہے نہ سرمایہ داری۔ "دنیائے مذاہب" میں اس قسم کا نظام تو ایک طرف' سرے سے نظام کا تصوّر ہی نہیں ملتا۔

ختمِ نبوّت نظام کے تصوّر سے' قرآنِ کریم نے ایک اور عظیم حقیقت کا اعلان کیا ہے جو "دنیائے مذاہب" میں بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے جن غیر متبدّل اصولوں کی ضرورت تھی' وہ قرآن میں دیدیئے گئے اور ان کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ ان اصولوں کی روشنی میں' ہر آنے والی نسل' اپنے معاملات' اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' خود حل کرے گی۔ اس لئے اب کسی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہٰذا بابِ نبوّت کو بند کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ ختمِ نبوّت' دنیائے مذاہب میں کتنے عظیم انقلاب کا اعلان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ اب ذہنِ انسانی' اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر اس شعور میں پہنچ گیا ہے۔ انسان اب بچہ نہیں رہا' بالغ ہو گیا ہے۔ اس لئے اب اسے کسی "آکر اُٹھانے والے" کی احتیاج نہیں رہی۔ اِسے اب خود اُٹھنا اور آگے چلنا ہو گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس سے انسان میں کس قدر خود اعتمادی (Self-Confidence) پیدا ہوتی ہے اور

وہ کس طرح دنیا میں گردن اُٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے!۔

دنیا کا ہر مذہب، کسی آنے والے کا انتظار کر رہا ہے جو آکر اس مذہب کو دوسرے مذاہب پر غلبہ عطا کرے گا۔ قرآن نے اس تصوّر کی تردید کر کے کہہ دیا کہ ہم نے جو نظامِ زندگی تمہیں دیا ہے اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ دنیا کے تمام نظامہائے زندگی پر غالب آجائے۔ **هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ** (9/33)۔ تم اس نظام کو عملاً منشکل کرو۔ یہ انسانوں کے تمام خود ساختہ نظامہائے حیات پر غالب آجائے گا۔ اس کے سامنے کوئی دوسرا نظام ٹھہر نہیں سکے گا۔

قرآن، اخلاقی اقدار پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس نظامِ زندگی کی اقامت کی تاکید کرتا ہے جس میں اخلاقی اقدار خود بخود غالب آجاتی ہیں۔

5۔ انسانی زندگی کا مُنتہٰی (نجات)

اس کے بعد، آپ اس سوال کی طرف آیئے جو اس بحث میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا مقصود و مُنتہٰی کیا ہے؟ یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال ہے اور اس سے بہت سے متعلّقہ گوشے خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

ہندو دھرم میں دنیا کے تمام مذاہب میں، انسانی زندگی کی تمام سعی و کاوش کے مُنتہٰی کو ایک لفظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ اور وہ لفظ ہے "نجات"۔۔۔ مُکتی (Salvation)۔ نجات سے مفہوم کیا ہے، یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور اسے اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے تو اسے نجات کہتے ہیں۔ یعنی نجات کے لئے ضروری ہے کہ وہ شخص پہلے کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ مذہب کی دنیا میں انسان کے متعلّق یہی بنیادی تصوّر ہے۔ ہندو مت (دھرم۔ یعنی شریعت) میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر ذی حیات (جاندار، خواہ وہ کیڑے مکوڑے ہوں، یا حیوانات اور انسان) اپنے سابقہ جنم کے کرموں (اعمال) کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ مثلاً ایک شخص موجودہ جنم میں انسان ہے۔ اس نے بُرے کام کئے تو وہ اگلے جنم میں چُوہا بن جائے گا۔ چُوہے کو قطعاً معلوم نہیں کہ وہ کس جُرم کی پاداش میں چوہا بنا دیا گیا ہے۔ اب اگر وہ چُوہا نیک کام کرے گا۔۔۔۔۔۔ چُوہا نیک کام کرے گا؟ گویا جانور بھی نیک کام اور بُرے کام کرتے ہیں!!۔۔۔۔۔۔ تو وہ آئندہ جنم میں (شاید) پھر انسان بن جائے۔ ہر انسان اس آواگون (Transmigration) کے چکّر میں پھنسا ہوا ہے، اس چکر سے چُھٹکارا مل جانے کا نام نجات ہے۔ صاف نظر

آتا ہے کہ یہ عقیدہ یا تو توہم پرستی کی پیداوار ہے اور یا ان لوگوں کے ذہنِ رسا کی تخلیق جنہوں نے کسی نہ کسی طرح معاشرہ میں اقتدار حاصل کر لیا اور اس کے بعد چاہا کہ وہ اقتدار انہی کے گھرانوں میں مخصوص رہے۔ دوسرے لوگ اِس اقتدار کے حصول کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ براہمن اور کھشتری حکمران طبقے تھے اور ویش اور شودر ان کے خدمت گزار۔ ہو سکتا تھا کہ کبھی کسی ویش یا شودر کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ براہمنوں اور کھشتریوں کے بچوں کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ یہ پیدائش کے ساتھ ہی حکمران بن جائیں اور ہم ان کی غلامی کرتے رہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ براہمن کے گھر میں پیدا ہی وہ ہوتا ہے جس نے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے ہوں اور ویش اور شودر کے ہاں وہی پیدا ہوتا ہے جس نے سابقہ جنم میں برے کام کئے ہوں۔ لہٰذا یہ تقسیم اعمال کے نتائج کے اعتبار سے عمل میں آتی ہے۔ یونہی دھاندلی سے پیدا نہیں کر دی گئی۔ انہیں اس زندگی میں بہرحال ویش اور شودر رہنا ہو گا۔ البتّہ اگر وہ اچھے کام کریں گے (یعنی اُتم جاتی کے لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے) تو اگلے جنم میں براہمن اور کھشتری بن جائیں گے۔ اس عقیدے کی رُو سے محکوم طبقات کو مطمئن کر دیا گیا کہ یہ سب ان کے اپنے کئے کا پھل ہے۔ ان پر ظلم نہیں ہو رہا۔ نہ ہی وہ اس جنم میں اس تقسیم کو بدل سکتے ہیں۔

اس عقیدہ کا جذبہ محرکہ کچھ ہی کیوں نہ ہو' اس کا نتیجہ جس قدر انسانیت سوز ہے وہ ظاہر ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس سے انسان مجبورِ محض ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ جی میں آئے کر لے' اپنی موجودہ پوزیشن میں تبدیلی کر ہی نہیں سکتا اور معاشرہ ایسے مستقل طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے جنہیں مٹایا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر یہ کہ' اس تمام تگ و تاز سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ کہ انسان اواگون کے اس چکّر سے نجات حاصل کر لے۔ انسانی تخلیق اور نظامِ کائنات کا یہ مقصد کس قدر بے معنی ہے؟

ویدانت کی رُو سے ہندو ویدانت (طریقت یا تصوّف) کی رُو سے' انسان کی رُوح (آتما)' خدا (پرماتما) کی روح کا حصہ ہے جو اپنی اصل سے جدا ہو کر' مادی دلدل میں پھنس چکی ہے اور یہاں سے نکلنے کے لئے مصروفِ آہ و فغاں ہے۔ مولانا روم کے الفاظ میں' جو اسی ویدانتی عقیدہ کی صدائے بازگشت ہے:

بشنو از نے چو حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ یہ رُوح' مادی دلدل سے نجات حاصل کر کے' اپنی اصل سے جا ملے۔ یعنی غالب کے الفاظ میں ـــــ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ـــــ ترکِ دنیا' سنیاس' اس کا طریقہ ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کی رُو سے' انسانی تگ و تاز کا ماحصل کیا ہے؟ فنا مکمل فنا (Complete Annihilation) یعنی خدا نے انسانی رُوح کو اپنے سے الگ کر کے' اسے مادی دلدل میں پھنسا دیا اور اُس سے

کہہ دیا کہ اب تم مشقتیں اٹھاؤ اور مصیبتیں جھیلو تاکہ تم اس دلدل سے نجات حاصل کر سکو۔ آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کی رُو سے خود خدا کے متعلق کیا تصوّر پیدا ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار کی پابندی کے لئے جذبۂ محرکہ کیا بنتا ہے؟

یہودیت میں یہودیت میں بھی انسانی زندگی کا مُنتہیٰ "نجات" ہے لیکن وہاں نجات کا تصوّر کچھ مختلف ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' یہودیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی چہیتی اولاد ہیں اس لئے وہی جنّت کے واحد وارث ہیں۔ جو انسان بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا نہیں ہوا' وہ جنّت میں نہیں جا سکتا۔ اس زمانہ میں بنی اسرائیل ہی میں ختنے کا رواج تھا اس لئے ان کا عقیدہ تھا کہ مختون سب جنّت میں جائیں گے اور غیر مختون جہنّم میں۔ چنانچہ تالمود میں ہے۔

> آخرت میں حضرت ابراہیمؑ جہنّم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اب رہے ایسے اسرائیلی جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے سو ان کے لئے وہ ایک کام کریں گے۔ وہ ان بچوں کی ختنہ کی کھال اتار کر جو ختنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے' اُس قسم کے اسرائیلیوں کے ختنے کے مقام پر چپکا دیں گے اور اس طرح انہیں نامختون بنا کر (چند دنوں کے لئے) جہنّم میں بھیج دیں گے۔ (تالمود صفحہ 404 بحوالہ برق طور صفحہ 166)

لیکن ان کا جہنّم میں داخلہ محض رسم (Formality) پوری کرنے کے لئے ہو گا'۔ جہنّم کی آگ اُن پر کچھ اثر نہیں کرے گی۔ (ایضاً" صفحہ 405) اس کی وجہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں یہ لکھی ہے کہ

> اسرائیلی گناہگاروں کو جہنّم کی آگ چھُو نہیں سکے گی۔ اس لئے کہ وہ جہنّم کے دروازے پر گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (جلد پنجم صفحہ (583)

اُخروی نجات ہی نہیں' بلکہ اس دنیا میں عزّت و سرفرازی کے لئے بھی یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ۔

> بعض کو عزّت ان کے آباء و اجداد کے اعمالِ حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کی آنے والی نسلوں کے اعمال کے صدقے میں۔ (جیوئش انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ششم صفحہ 60)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ

> یہودیوں کی اُمیدوں کا مرکز اُن کے آبا واجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ (حضرت) ابراہیمؑ ہمارے جدِّ امجد ہیں۔

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس میں مذکور ہے کہ

یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کر لئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصّے میں نجات و سعادت آجائے گی۔ (جلد 11_ صفحہ 144)

آپ غور فرمائے کہ ان عقائد کی موجودگی میں اخلاقی اقدار کی پابندی کا کوئی سوال بھی پیدا ہوتا ہے؟

عیسائیوں میں عیسائیت میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ' اپنے اوّلین ماں باپ (آدم و حوّا) کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان سے ان گناہوں کی آلائش کا دُور ہو جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے لئے خدا نے انسانوں پر رحم کھایا اور اپنے اکلوتے بیٹے (یسوع مسیح) کو دنیا میں بھیجا کہ وہ صلیب پر جان دے کر ان کے گناہوں کا کفّارہ ادا کر دے۔ جو لوگ حضرت مسیح کے اس کفّارہ پر ایمان لائیں گے' ان کی نجات ہو جائے گی۔ جو ایمان نہیں لائیں گے وہ جہنّم میں جائیں گے۔ نجات کے لئے اعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ سینٹ پال' افسیون کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے۔

تم کو ایمان کے وسیلے ہی سے نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں' خدا کی بخشش ہے اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔ (افسیون 9-2/8)

اور رومیوں کے نام خط میں ہے۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان شریعت کے اعمال کے بغیر' ایمان کے سبب سے راستباز ٹھہرتا ہے۔ (3/28)

گلتیون کے نام ایک خط میں اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ

جتنے لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں وہ لعنتی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں... مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا (معاذ اللہ) اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔ (گلتیون 14-3/10)

آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کے بعد' اخلاقی اعمال کی کہیں گنجائش بھی رہتی ہے۔ بلکہ اس کی رُو سے' جو شخص اعمال پر بھروسہ کرتا ہے وہ لعنتی قرار پاتا ہے۔ عیسائیت کے اس عقیدہ کی رُو سے' انسان جس مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے وہ اس کے اپنے کسی جُرم کا نتیجہ نہیں' بلکہ اس کے اوّلین ماں باپ کے گناہوں کی پاداش ہے جس میں یہ بیچارہ مفت میں ماخوذ کر دیا گیا ہے اور پھر اس مصیبت سے چھٹکارا' کسی حُسنِ عمل کے نتیجہ

میں نہیں ملتا' بلکہ حضرت مسیحؑ کے کفّارہ پر ایمان سے ملتا ہے- باقی رہا "ازلی گناہ" کے عقیدہ کا باطل ہونا' سو اس کے متعلق اب خود عیسائی دنیا کے اربابِ فکر و تحقیق' اعلان پر اعلان کر رہے ہیں کہ یہ عقیدہ باطل ہے- مثلاً (R.F. Johnson) اپنی کتاب (Confucianism and Modern China) میں لکھتا ہے کہ

> ازلی گناہ کا عقیدہ درحقیقت "ازلی خرابی" ہے جس کی وجہ سے ہم ہر قسم کے خیر سے بیزار اور ہر قسم کے شر کی طرف مائل رہتے ہیں-

مسٹر (A.E. Taylor) لکھتا ہے-

> یہ عقیدہ ایک بطلان ہے- میں کسی ایسے سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والے مذہب کا استقبال کروں گا جو ہمیں فطرت انسانی پر ایسی مضحکہ انگیز تہمت پر ایمان رکھنے کی ضرورت سے بچا لے- (Mind _ July 1912)

قرآن کی رُو سے "یہ سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والا مذہب" اسلام ہے جس نے اعلان کر دیا کہ کوئی انسان' نہ اپنی سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور نہ اپنے اوّلین ماں باپ کی لغزشوں کی آلائش سے ملوث ہوتا ہے- دنیا میں ہر انسانی بچہ سادہ لوح (Clean Slate) لے کر آتا ہے اور واجب التکریم پیدا ہوتا ہے- اس کے اندر' حیوانی سطح کی طبیعی زندگی سے بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں بطور امکانات (Realisable Possibilities) رکھ دی گئی ہیں ان صلاحیتوں (Potentialities) کی نشوونما (Development) انسانی زندگی کا مقصود ہے اگر انسان صرف اپنی طبیعی زندگی (Physical Life) کی صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے تو اسے طبیعی دنیا کی آسائشیں اور قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن اسے انسانی سطح کی بلند زندگی نصیب نہیں ہوتی" جسے قرآن جنّتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے- **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا** (17/18)- جو صرف دنیاوی زندگی کا مفادِ عاجلہ چاہتا ہے' اسے ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق' جسے ہم نے اپنے ارادے سے بنایا ہے' بہ عجلت دیدیتے ہیں- لیکن اس کی (انسانی) زندگی جہنم کی زندگی ہوتی ہے جسے وہ ذلّت و خواری میں بسر کرتا ہے- لیکن جو شخص طبیعی زندگی کے ساتھ' اپنی انسانی زندگی کی نشوونما بھی کرتا ہے اسے طبیعی مفاد بھی حاصل ہوتے ہیں اور اس کی ذات میں بھی بالیدگی اور اِرتقاء ہوتا چلا جاتا ہے **وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا** (17/19)- اور جو مستقبل کی خوشگواریاں چاہتا ہے اور اس کیلئے ایسی کوشش کرتا ہے جیسی کرنی چاہئے' اور وہ خدا کی متعیّن کردہ بلند اقدار کی صداقتوں پر ایمان رکھتا ہے' تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہو جاتی ہیں- **كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا** (17/20)- ہم اس گروہ کو بھی' اپنے

قانونِ مشیّت کے مطابق' بڑھاتے رہتے ہیں' اور اس گروہ کو بھی- اور ان کی سعی و عمل کے حساب سے انہیں اپنی بخشائشوں سے نوازتے ہیں- یاد رکھو! ہم نے اپنی ان نعمتوں پر بند نہیں لگا رکھے کہ کسی قوم کو اس سے آگے نہ بڑھنے دیں اور کسی سے رعایت برت کر اس کے لئے یونہی دروازے کھول دیں-

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

انسانی ذات کی یہ نشوونما اس نظام کے اندر ہو سکتی ہے جو مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے- یہ نشوونما' اعمال کے فطری نتائج کا نام ہے- نیک اعمال وہ جن سے انسانی ذات کو استحکام و بالیدگی ملتی ہے- بُرے وہ جن سے اسے ضعف پہنچتا ہے- ہر عمل کا نتیجہ' ساتھ کے ساتھ' انسانی ذات پر مرتّب ہوتا رہتا ہے- یہی اس کا اعمالنامہ ہے جو قرآن کے الفاظ میں' اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے اور جو ظہورِ نتائج کے وقت کھُل کر سامنے آجاتا ہے- جو انسانی ذات ایک خاص معیار کے مطابق نشوونما پا لے گی وہ زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے گی--- اسے جنّتِ اُخروی کی زندگی کہتے ہیں- جو اس معیار پر پوری نہیں اُترے گی اُس کی نشوونما رُک جائے گی--- یہ جہنّم کی زندگی ہے- اسی کو قرآن نے پلڑے کے بھاری اور ہلکا ہونے سے تعبیر کیا ہے- **فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۭ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ** (101/6-9)- سو جس کا پلڑا بھاری ہو گا وہ مسرّتوں کا جھولا جھولے گا- اور جس کا پلڑا ہلکا ہو گا' وُہ تباہی کے گڑھے میں جا گرے گا-

آپ نے دیکھا کہ قرآن کی رُو سے' مقصدِ زندگی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں' بلکہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی مناسب نشوونما سے' ایک بلند مقام حاصل کرنا' اور موجودہ زندگی سے اعلیٰ و ارفع سطح زندگی پر پہنچ جانا ہے- اسے قرآن نے فوز اور فلاح کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے- یعنی (Achievement) اور (Success) نہ کہ نجات (Salvation)- اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہو گا کہ اس تصوّر کے ماتحت اس سوال کا جواب کس حُسن و خوبی سے مل جاتا ہے کہ میں اخلاقی اقدار کی پابندی کیوں کروں- اس سے میرا کیا فائدہ ہو گا اور ایسا نہ کرنے سے کیا نقصان- یہی وہ طریق ہے جس سے انسان ان اقدار کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت (Rationally) کرتا اور قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے ان پر کاربند رہتا ہے-

---

الدین تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قرآنِ کریم چند اخلاقی اقدار ہی نہیں دیتا بلکہ زندگی کا ایک ہمہ گیر نظام عطا کرتا ہے جو خدا- انسان- کائنات- قانونِ مکافات- اور مقصد و مالِ زندگی کے بنیادی تصورات پر اُستوار ہوتا ہے- اس پورے نظام کا نام الدّین ہے اور اس کی عملی شکل کو الاسلام کہا گیا ہے-

اخلاقی اقدار اسی نظام کے اندر نتیجہ خیز ہوتی ہیں اور علی وجہ البصیرت ممکن العمل بھی۔ اس نظام کے سوا کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں جس میں یہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (3/18)

یہ حقیقت ہے کہ الدّین' اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے

اس لئے مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ (3/84)۔ جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور نظامِ زندگی اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے اس نظام کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور وہ دیکھ لے گا کہ آخر الامر وہ کس قدر نقصان میں رہتا ہے۔

اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے گا

نظام کے تصوّر سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس کے مختلف اجزا کے نتائج اسی صورت میں مرتّب ہو سکتے ہیں جب اس نظام کو بالکلیہ اختیار کیا جائے۔ نظام کی مثال' طبیب کے نسخے کی سی ہوتی ہے۔ نسخے کا فائدہ اُسی صُورت میں ہو سکتا ہے' جب آپ اُسے پورے کا پورا' متعلقہ ہدایات کے مطابق استعمال کریں۔ اگر آپ اس نسخے میں سے ایک دو دوائیاں لے کر انہیں استعمال کرنا شروع کر دیں تو وہ آپ کو کچھ بھی فائدہ نہیں دیں گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ نقصان ہی دے دیں۔

اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ..... (2/85)

"کیا تم اِس ضابطۂ قوانین کے ایک حصّہ کو ماننا چاہتے ہو اور ایک حصّے سے انکار کرنا چاہتے ہو؟ جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ اس کے لئے اس دنیا کی زندگی میں ذلّت و رسوائی ہو۔ اور وہ قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں" اس نسخہ کے اجزائے ترکیبی' وہ تمام صفاتِ خُداوندی ہیں جنہیں قرآن الاسماء الحُسنٰی کہہ کر پکارتا ہے۔ ان میں سے بعض اجزاء کو لے لینا اور دوسرے اجزاء کو چھوڑ دینا' کچھ بھی مُفید نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے۔ حقیقت (Reality) ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Whole) ہے جس کے حصّے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ خدا کے الاسماء الحُسنٰی حقیقتِ مطلق کے مختلف پہلو (Facets) ہیں۔ حقیقت ان تمام کے مجموعے کا نام ہے۔ ان میں سے بعض کو الگ کر لیا جائے تو وہ اس حقیقت کے اجزاء نہیں قرار پا سکتے۔ مثلاً اگر حقیقت کے سو گوشے ہیں اور ان میں سے آپ دس گوشے الگ کر لیتے ہیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے حقیقت کے 1/10 حصہ کو اختیار کر لیا ہے' اس لیے آپ کو اسی تناسب سے وہ فائدہ ہو جائے گا جو پوری حقیقت کے اختیار کرنے سے ہوتا۔ آپ

نسخے کی دس دوائیوں میں سے ایک دوائی کھا کر دسواں حصّہ شفا حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ

(7/180)۔

"اور اللہ کے لئے الاسماء الحُسنٰی ہیں (وہ اس حقیقتِ کُلّی کے مختلف گوشے ہیں) سو اسے ان تمام گوشوں کے ساتھ پکارو۔ اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ان اسماء (صفات) میں سے (بعض کو لے کر) ایک طرف نکل جاتے ہیں"۔ آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اسلامی نظامِ زندگی سے الگ رہتے ہیں ان کے ہاں جن اخلاقی اقدار پر عام طور پر زور دیا جاتا ہے وہ وہی ہوتی ہیں جن کا تعلّق انسان کے نرم و نازک جذبات سے ہوتا ہے۔ ہمدردی۔ رحم۔ عفو۔ در گذر۔ منکسر المزاجی۔ نرم خوئی۔ کوئی دس گالیاں بھی دے جائے تو خاموش رہو۔ جو ایک گال پر طمانچہ مارے' اس کے سامنے دوسرا گال بھی کر دو۔ جو تمہارا کوٹ اُتارے اسے صدری اُتار کر خود دے دو۔ دشمن سے بھی پیار کرو۔ یا ذرا آگے بڑھو تو چڑیوں' کوؤں کو دانہ ڈالو۔ مویشیوں کے لئے پیاؤ بنا دو۔ وغیرہ وغیرہ۔ عدل' ظلم کی روک تھام' سلب و نہب (Exploitation) کا انسداد۔ عالمگیر انسانیت کے حقوق کا تحفّظ۔ ایسا سیاسی نظام جس میں کوئی کسی کا محکوم نہ ہو۔ ایسا معاشرتی نظم و نسق جس کی بنیاد احترامِ آدمیت پر ہو۔ ایسا معاشی دستور جس میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی بلا مشقت و ذلّت پوری ہوتی رہیں۔ ایسا عمرانی آئین جس کی رُو سے ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ پیدا کرتا چلا جائے۔ ان باتوں کی ان کے ہاں کوئی اخلاقی اہمیت نہیں ہو گی۔

عیسائیت کی تعلیم کا نتیجہ عیسائیت جو مذکورہ بالا قسم کی اخلاقی اقدار کی سب سے بڑی علمبردار ہے' اس کے متعلق' ہسپانیہ کے نامور پروفیسر (Dr. Falta De Cracia) کے الفاظ میں سنئے جنہیں' برفو (Brifault) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (The Making of Humanity) میں نقل کیا ہے' وہ لکھتا ہے۔

> عیسائیت میں عدل کا تصوّر بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصوّرِ اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں۔ لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ تسامح برتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کو جو ظلم و اِستبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں' جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو' دعوت دی ہے۔ اور انہیں آئین محبت کی تعلیم دی ہے۔ انہیں' رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے۔ انہیں خدا کی ربوبیت کی یاد دلائی ہے۔ لیکن مذہب و اخلاق کے اس طوفان میں جس کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ' وہ اخلاقی ضوابط کی

معراجِ کبریٰ ہے' عام انصاف اور دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس۔ جَور واستبداد کے ستائے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان' آسمان سے اُترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے جو اُن کی طرف فارقلیط کا پیغامِ رحمت و شفقت پہنچاتا ہے۔ لیکن اس جَور و استبداد کی علّت معلوم کرنا اس کے دائرہ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصوّر اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے۔ نظامِ عالم کا خاصہ ہے۔ اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بنا پر قائم ہے۔ سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنّم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیام عام کرتا ہے اور گناہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنّم کا قیام ہے' اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں' انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہیں' ان کی ہڈیاں چیختی رہیں' وہ مِٹ جائیں۔ فنا ہو جائیں' عیسائیت کی رُوح انہیں جا کر تسلی دے گی۔ لیکن یہ اس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح سے مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کا اسے احساس ہی نہ ہو گا۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی رُوح یکسر بے حس ہے۔ یہ تصوّر اس کے نزدیک ایسا ہی اجنبی ہے جیسا صداقت کا تصوّر' وہ ہمیشہ عفو' برداشت' رحمدلی کا سبق پڑھاتی رہی۔ لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد تک نہ آئی۔ زندگی اور اس کی تمام خود داریوں کا ترک۔۔۔۔ قدسیہ آرزو۔۔۔۔ عدم مدافعت' خاموش اطاعت' ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا' غرضیکہ اس قسم کے متشدّد (غیر فطری) ضابطۂ اخلاق کا طوفان' عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا۔ لیکن ظلم و استبداد اور جَور و ستم کے کسی منظر سے وہ متأثر نہیں ہو سکتی تھی۔ (The Making of Humanity PP. 332-333)

لامذہبوں کی حالت یہ تو رہی مذہب پرست طبقہ کی اخلاقی اقدار کی کیفیت۔ اب ان لوگوں کو لیجئے جو نہ خدا کو مانتے ہیں' نہ انسانی ذات کی بقا کو۔ نہ وحی کے قائل ہیں نہ حیاتِ آخرت کے۔ اور اس کے باوجود اخلاقی اقدار کی تلقین کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی سے پوچھئے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ (مثلاً) غریب کی مدد

کرنی چاہئے' تو مجھے سمجھایئے کہ میں غریب کی مدد کیوں کروں؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے اس کے عجیب و غریب قسم کے جوابات ملیں گے۔ کوئی کہے گا کہ یہ انسانی فریضہ ہے کہ ہم غریب کی مدد کریں۔ ان سے پوچھئے کہ صاحب! انسانی فریضہ کا مطلب کیا ہے' اور وہ کون ہے جس نے مجھ پر یہ فریضہ عائد کر رکھا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ اس کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہو گا۔ کوئی کہے گا کہ ہمیں غریب کی مدد اس لئے کرنی چاہئے کہ اگر ہم کل کو غریب ہو گئے تو دوسرا ہماری مدد بھی کرے۔ اول تو یہ معاوضہ (Reciprocity) کا جذبہ اس قدر پست ہے کہ اسے آپ کبھی بھی بلندیٔ کردار سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ جو لوگ اس کا انتظام کر لیں کہ انہیں کسی کی مدد کی کبھی ضرورت نہ پڑے' انہیں آپ غریبوں کی مدد کے لئے کس طرح آمادہ کر سکیں گے؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی اپیل یکسر جذبات سے ہو گی۔ دلیل و بُرہان کی رُو سے وہ کوئی معقول جواب نہیں دے سکیں گے اور یا' ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو ان کے تحت الشعور میں' یہ جذبات کروٹیں لے رہے ہوں گے کہ ان باتوں کو معاشرہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے' اس لئے معاشرہ میں عزّت حاصل کرنے کے لئے یہ کچھ کرنا چاہئے اور یا اس کے پیچھے سیاسی محرکات کار فرما ہوں گے۔ جیسے مشنریوں کے ہسپتال اور اسکول و کالجز' یا مہاتما گاندھی (آنجہانی) کی اہمسا۔ یا یہ نتیجہ ہو گا روایتی اور وراثتی عقائد کا اور یا انسان کے کمزور اعصاب کا جن کا نام نیک جذبات رکھ لیا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی انسانی کردار کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ باقی رہا نیشنل کیریکٹر' سو اس کے متعلّق شروع میں عرض کیا جا چکا ہے۔ جذبات کے زور پر آپ کسی سے ہنگامی طور پر تو کوئی اچھا کام کروا سکتے ہیں۔ لیکن اس اچھے کام کو اس کی زندگی کا معمول نہیں بنا سکتے۔ اس میں ثبات و دوام نہیں پیدا کر سکتے۔ اور کیریکٹر کہتے ہی اس نہجِ زندگی اور اسلوبِ حیات کو ہیں جس میں ثبات و دوام ہو۔ اس ثبات و دوام کا ضامن' صحیح تصوّرِ حیات پر ایمان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن ان لوگوں کو بھی جو کسی نہ کسی مذہب کے پیرو ہیں اور انہیں بھی جو کسی مذہب کو نہیں مانتے' زندگی کے ان تصوّرات پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جو اس کے نظام کے اصل و بنیاد ہیں وہ ان کے متعلّق کہتا ہے کہ

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (2/137)۔

اگر یہ لوگ ان تصوّرات پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو' تو پھر یہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ ایسا نہ کریں' تو پھر سمجھ لو کہ یہ صداقت و حقیقت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس راہ پر چل نہیں رہے۔

یہ ہیں برادرانِ عزیز اسلام کی وہ خصوصیات جو نہ مذاہبِ عالم میں کہیں مل سکتی ہیں اور نہ ہی دنیائے فکر میں۔ اس لئے دین الحق اس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

مسلمانوں کو انتباہ اس مقام پر میں ایک انتباہ ضروری سمجھتا ہوں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم یہ کہہ کر کہ ہمارا دین تمام مذاہب سے افضل ہے' خوش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے ہم بھی دنیا میں سب سے افضل قرار پا جاتے ہیں اور (اگر دنیا میں ہماری حالت اچھی نہیں تو اس کی چنداں پرواہ نہیں۔ اس لئے کہ دنیا چند روزہ ہے اس کے بعد) آخرت میں جنّت کے وارث ہمیں ہوں گے۔ باقی سب جہنّم میں جائیں گے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے یہ بہت بڑی خود فریبی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ (قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہی کچھ یہودی بھی کہا کرتے تھے۔ اس سے اُن کی جو حالت ہوئی وہ دنیا پر روشن ہے)۔ اسلام کا افضل ہونا ہمیں اس صورت میں فائدہ دے سکتا ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کر کے خود افضل بن کر دکھائیں۔ خود ذلّت و خواری کی زندگی بسر کرنا اور اسلام کی افضلیت پر ناز کرتے رہنا' حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص دنیا بھر میں ڈھول پیٹتا پھرے کہ ہمارے ہاں ایک خاندانی نسخہ ہے جو اکسیرِ حیات ہے اور تمام بیماریوں کا مجرّب علاج۔ اور خود اپنے سر درد کے لئے بھی دوسروں سے دوائی مانگتا پھرے۔ کہئے کہ ایسے شخص کو وہ نسخہ کیا فائدہ دے سکتا ہے اور اس کا اس پر فخر کرنا اس کے کس کام آسکتا ہے؟ اس سے تو اس کی اُلٹی جگ ہنسائی ہو گی اور کوئی شخص اس کے دعوے کو صحیح تسلیم نہیں کرے گا۔ نسخہ کے مجرب ہونے کا اوّلین اور بُنیادی ثبوت خود اس خاندان کی اپنی صحت ہو گی۔ اسلام نے اپنی صداقت اور فوقیت کا یہی ثبوت پیش کیا تھا۔ جب نبی اکرمؐ نے اس دین کے مخالفین سے کہا تھا کہ

يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6/136)

تم اپنے نظام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ میں اپنے نظام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ عن قریب معلوم ہو جائے گا کہ اس گھر کی کامیابی آخر الامر کس کے حصے میں آتی ہے۔ اس طرح میرا یہ دعویٰ سچ بن کر سامنے آجائے گا کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی اور ایسا کہنے والے نے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو اپنے دعوے کی صداقت میں بطور شہادت پیش کر دیا۔ جب حضورؐ کے مخالفین نے آپؐ سے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10/16)

میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں سمجھ سکتے کہ ایسی زندگی سچّے کی

ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

یاد رکھئے ! عزیزانِ من- دنیا میں اسلام کو بطور ایک سچّے دین کے وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو دوستوں کی محفل میں نہیں بلکہ دشمنوں کے بھرے مجمع میں' اپنی زندگی کو اپنی صداقت کی شہادت میں پیش کر سکے اور پھر اس کے خلاف کسی کو اُنگلی اٹھانے کی جرأت نہ ہو- یہی اسلام کی تبلیغ کا صحیح طریقہ ہے-

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اب آخر میں' میں دو ایک ایسے شکوک کا ازالہ ضروری سمجھا ہوں جو اس ضمن میں اکثر دلوں میں پیدا ہوتے ہیں- سب سے پہلے یہ کہ قرآنِ کریم دیگر اہلِ مذاہب سے کہتا ہے کہ میں مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ہوں- یعنی جو تعلیم تمہارے پاس ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں- سو جب قرآنِ کریم خود ان مذاہب کی تعلیم کو سچّا تسلیم کرتا ہے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خُدا کی طرف سے سچّی تعلیم صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے' دیگر اہلِ مذاہب کے پاس نہیں-

اعتراض واقعی وزنی ہے اور اس کا جواب نہایت ضروری- سب سے پہلے آپ یہ دیکھئے کہ کیا یہ مطالبہ کہ دیگر اہلِ مذاہب اس پر ایمان لائیں' قرآنِ کریم کا مطالبہ ہے یا یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے؟ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ والے ٹکڑے کی پوری آیت یوں ہے- یہود سے کہا جاتا ہے کہ

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (2/41)

"تم اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) جو مُصدِّق ہے اس کا جو تمہارے پاس ہے- اور سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بنو" ! اس سے ظاہر ہے کہ قرآن خود اہلِ مذاہب سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں-

دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم میں متعدّد مقامات پر یہ تصریح موجود ہے کہ' ان اہلِ مذاہب نے اپنی اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کر دی تھی- لفظی تحریف بھی (4/71)- اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کر دیئے تھے (3/71)- اس طرح ان کتابوں میں بے شمار (2/79) اور حق کو باطل کے ساتھ مخلوط-بھی کر دیا تھا اختلافات پیدا ہو چکے تھے- (11/110)- قرآن کے ان دعاوی کی شہادت خود یہ اہلِ مذاہب دیتے ہیں- چنانچہ کوئی غیر مسلم بھی آج اس کا بدلائل دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جس کتاب کو وہ اپنی آسمانی کتاب کہہ کر پیش کرتے ہیں' وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں وہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی- اس اجمال کی تفصیل آپ کو میری کتاب' معراجِ انسانیت' کے بابِ اوّل میں ملے گی جس میں تمام مذاہبِ عالم کی مُبیّنہ آسمانی کتابوں کی تاریخ خود ان مذاہب کے متبعین تحقیق کے مطابق بیان کی گئی ہے- اس سے ظاہر ہے کہ جن کتابوں کو خود ان کے متبعین بھی حقیقی اور غیر محرف نہیں کہتے' قرآنِ کریم ان کی صداقت کی شہادت کس طرح دے سکتا ہے-

ان کتابوں میں' اس قدر تحریف و الحاق کے باوجود' کچھ اخلاقی اقدار موجود ہیں۔ قرآنِ کریم ان اقدار کی تصدیق کرتا ہے' نہ کہ پوری کی پوری کتابوں کی۔ اصل یہ ہے کہ یہاں مُصَدِّق کے معنی' "تصدیق کرنے والا" نہیں۔ اس کے معنی ہیں "سچ کر کے دکھانے والا"۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ تمہارے پاس جو اخلاقی اقدار ہیں' وہ محض نظری حیثیت سے ہیں۔ میں وہ نظام دیتا ہوں جس میں یہ اقدار' سچی حقیقتیں بن کر سامنے آجائیں اور یہی میری خصوصیت ہے۔ مثلاً تم بھی یہ کہتے ہو کہ بھوکے کو روٹی کھلانی چاہئے' اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ تم اسے محض وعظ و نصیحت کے طور پر کہتے اور اور لوگوں کو خیرات دینے کی تلقین کرتے ہو۔ اس سے جس طرح لوگوں کی بھوک کا علاج ہوتا ہے' اسے ہر شخص جانتا ہے؟ میں ایک ایسا عملی نظامِ معیشت عطا کرتا ہوں جس میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اس طرح میں' اس اخلاقی قدر کو سچ کر کے دکھا دیتا ہوں۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے عملی نظام کی رُو سے' یہ تمام اخلاقی قدریں سچ بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ یہ چیز دین میں ممکن ہے۔ "مذہب" میں نہیں۔ اس لئے اسلام کو الدّین کہا گیا ہے' مذہب نہیں کہا گیا۔ اس کا مقابلہ بھی دنیا کے دوسرے نظامہائے زندگی سے کرنا چاہئے' مذاہب سے نہیں۔

دوسرا شُبہ دوسرا سوال یہ اُٹھایا جاتا ہے کہ بے شمار لوگ ایسے ہیں جن تک اسلام پہنچا ہی نہیں۔ یا (مثلاً) ایک شخص ہندوؤں کے گھر پیدا ہوتا ہے اور نہایت دیانتداری سے اپنے دھرم کو سچا سمجھ کر اس پر کاربند رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کیا قصور ہے کہ ان پر فلاح و فوز کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ یہ سوال بھی بہت سے قلوب کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔

اگر نجات و سعادت یا جزا سزا کا معاملہ محض جذباتی ہوتا تو واقعی یہ بات قابلِ تسلیم ہوتی کہ جن لوگوں کا کچھ قصور نہیں' انہیں سزا کیوں دی جائے۔ لیکن جب جزا سزا کا تعلق قانون سے ہو اور فوز و فلاح' اعمال کے فطری نتائج کا نام تو اس میں جذبات کا دخل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس گاؤں میں مدرسہ نہیں اس کے بچے اَن پڑھ رہ جائیں گے اور جو فوائد پڑھے لکھے لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں وہ ان سے محروم رہیں گے۔ یہ بہت بڑی سزا ہے جو ان بچوں کو مل رہی ہے' حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ آپ ان سے کتنی ہمدردی کیوں نہ کریں' علم سے بے بہرہ رہنے سے جو کمی اُن میں آگئی ہے' آپ کی ہمدردیاں اور رقیق جذبات اس کمی کو دور نہیں کر سکتے۔ یہاں یہ سوال ہی نہیں کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ جو بچہ بیماری کی وجہ سے سال بھر اسکول نہ جا سکے' آپ اسے اس بنا پر اگلی جماعت میں نہیں چڑھا دیتے کہ اس میں اس کا کیا قصور ہے! اگلی جماعت میں اسے ہی چڑھایا جائے گا جس میں اس جماعت میں چلنے کی استعداد پیدا ہو چکی ہو گی۔ قرآن کی رُو سے' زندگی کے اگلے مراحل میں وہی پہنچ سکے گا جس میں اِن مراحل کے طے کرنے کی صلاحیت پیدا

ہو چکی ہو گی۔

اسی اصول کا اُن لوگوں پر بھی اطلاق ہو گا جو نہایت نیک نیتی سے مذہب کو صحیح سمجھ کر اس پر کاربند رہتے ہیں۔ جو شخص نہایت نیک نیتی سے سنکھیا کو دوائی سمجھ کر کھا لیتا ہے' سنکھیا یہ کہہ کر اپنا مُضر اثر نہیں روک لے گا۔ کہ کھانے والے نے اسے نہایت نیک نیتی سے دوائی سمجھ کر کھایا تھا۔ سنکھیا اپنا اثر یکساں کرے گا۔ خواہ کسی نے اسے دیدہ دانستہ کھایا ہو یا غلطی سے۔ جو قوم آگ اور پانی (اگنی اور اندر) کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کرتی رہے' وہ بھاپ کو اپنے کنٹرول میں لا کر انجن نہیں چلا سکتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم ان تمام فوائد سے محروم رہے گی جو بھاپ (Steam) کی قوت (Power) سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی یہ محرومی' کسی کی طرف سے ملی ہوئی انتقامی سزا نہیں۔ ان کی جہالت کا فطری نتیجہ ہے جسے ہمدردی کے کوئی جذبات دُور نہیں کر سکتے۔ یہ اُسی صورت میں دُور ہو سکتی ہے کہ وہ قوم قوانینِ خداوندی کی طرف رجوع کرے اور فطرت کی ان قوتوں کو مسخر کر کے ان سے اپنے فائدے کے کام لے۔ قرآن کی رُو سے' فلاح و فوز کے لئے یہی قانون مقرر ہے۔ اس میں نہ کسی کی آرزوؤں کا دخل ہے نہ جذبات کا تعلق۔ اس کا واضح اعلان ہے کہ

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (4/123)۔

فیصلہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہو گا اور نہ ہی اہلِ کتاب کی آرزوؤں کے مطابق۔ (فیصلہ ہمارے قانون کے مطابق ہو گا اور وہ قانون یہ ہے کہ جو بھی غلط کام کرے گا' وہ اس کا نتیجہ بھگتے گا۔ اور قانون کو ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ اگر قانون لوگوں کے جذبات کے تابع چلنے لگے تو سلسلۂ کائنات درہم برہم ہو جائے۔

لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (23/70)۔

اگر حق لوگوں کے خواہشات کے تابع چلنے لگے تو ارض و سموات اور جو کچھ ان کے اندر ہے' سب تہس نہس ہو جائے۔ خدا ہو ہی وہ سکتا ہے' جو جذبات سے بلند ہو۔ اسی لئے' جو قومیں اپنے جرائم کے نتیجہ میں تباہ و برباد ہوتی ہیں' ان کے متعلق وہ کہتا ہے کہ **فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝** (91/14-15)۔ ان کے ربّ نے ان پر (قانونِ مکافات کا) (Road-Roller) بھیج دیا جس نے انہیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا اور ان کے انجام کے خیال سے خدا کے دل میں کوئی خوف اور ڈر پیدا نہ ہوا۔ وہ اس پر قطعاً" لرزاں و ترساں نہ ہوا۔ حتیٰ کہ **فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ** (44/29)۔ نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین۔

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس کے قانون میں توبہ اور باز آفرینی کی گنجائش ہی نہیں۔ جس سے کوئی ایک

جُرم سرزد ہو گیا وہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گیا۔ نہیں ! اس کے ہاں احساسِ ندامت کے بعد' اصلاح کا ہر وقت موقع ہوتا ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا - (39/53)

"ان سے کہہ دو کہ اے میرے بندو ! جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے' تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' وہ تمہاری تمام لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کر دے گا"۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ایسے اچھے کام کرو جن سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے جو غلط روی سے تمہیں پہنچا ہے۔ اس لئے کہ **اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ** (11/115)- ناہمواریوں کے مضر اثرات کو حسن کارانہ زندگی کے اعمال ہی مٹا سکتے ہیں۔

ہماری ذمّہ داری اب رہی آخری بات کہ جن لوگوں تک اسلام کا پیغام نہیں پہنچ سکا تو اس کی ذمّہ داری کس پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمّہ داری ہم پر ہے جو اس کتاب کی وراثت کے مدعی ہیں۔ ہم اگر اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہتے ہیں تو ان لوگوں کی غلط روی کا بار' جن تک ہم نے اسلام نہیں پہنچایا' ہماری گردن پر ہے۔ اسی کے لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ **لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ** (29/13)- وہ اپنے بوجھ بھی اُٹھائیں گے اور ان کے ساتھ دوسرے بوجھ بھی۔ اس وقت اقوامِ عالم' حق و صداقت کا نظام سامنے نہ ہونے کی وجہ سے' جس قدر انسانیت سوز جرائم کی مرتکب ہو رہی ہیں' ان کے عذاب کا ایک حصّہ خود ہماری گردن پر بھی ہے اور یہ چیز ہماری حالت سے عیاں ہے۔ خدا نے ہمیں "شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" بنایا تھا۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کی نگرانی کا فریضہ ہمیں سونپا تھا۔ ہم' دوسروں کی نگرانی تو کجا' خود اپنی نگرانی کے بھی قابل نہ رہے۔ سو اس کا خمیازہ اُٹھا رہے ہیں۔ جب کہیں چوری ہو' تو سو جانے والا چوکیدار سب سے پہلے دھر لیا جاتا ہے۔ سو ہم اس غفلت کی سزا بھگت رہے ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ کہ اسلام تمام ادیان پر فوقیت رکھتا ہے' ہمیں اس عذاب سے قطعاً نہیں بچا رہا۔ اور نہ ہی بچائے گا' جب تک ہم اس پر عمل کر کے خود اپنے آپ کو اس فوقیت کا مستحق نہ بنا لیں۔

آخر میں' میں اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس تقریر میں کہا ہے اس سے نہ کسی اہلِ مذہب کی دل آزاری مقصود ہے اور نہ ہی ان کے بانیانِ مذاہب میں سے کسی کی (معاذ اللہ) تحقیر مطلوب۔ جہاں تک غیر مذاہب کے بانیوں کا تعلّق ہے' قرآن کی رُو سے ہمارا ایمان ہے کہ خدا نے دنیا کی تمام اقوام کی طرف اپنے رسول بھیجے تھے۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی کی صراحت قرآن نے کر

دی ہے اور باقیوں کا نام لیکر ان کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن کسی کا نام قرآن میں آیا ہے یا نہیں' ہم ان تمام فرستادگانِ خداوندی کا دلی ادب و احترام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی رسالت کا اقرار' ہمارا جُزوِ ایمان ہے۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ ان حضرات کی طرف سے تو خدا کی سچی تعلیم پیش ہوئی تھی لیکن بعد میں اس تعلیم میں کمی بیشی ہو گئی۔ اور اب وہ اصلی اور حقیقی تعلیم قرآنِ کریم کے اندر ہے۔ جب ہم اس حقیقت کو پیش کریں گے کہ اب اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے' تو اس کی تعلیم کے سامنے لامحالہ دوسرے مذاہب کی وہ تعلیم لانی پڑے گی جو قرآن کے خلاف ہے اور اس لئے ہمارے نزدیک سچی نہیں ہو سکتی۔ میں نے غیر مذاہب کی تعلیم کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس مقصد کے پیشِ نظر کہا ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے کہ اسلام کسی کو بُرا کہہ کر اپنے آپ کو اچھا ثابت نہیں کرنا چاہتا' وہ اپنی اچھائی کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا اور دلائل و براہین سے منواتا ہے۔ قرآن کا حکم تو یہ ہے کہ تم مشرکین کے بتوں کو بھی گالی نہ دو۔ وہ تمام دنیا کی واجب الاحترام ہستیوں کا احترام سکھاتا ہے البتہ ان کی' یا ان کی طرف منسوب کردہ' غلط تعلیم کو غلط قرار دیتا ہے۔ یہی شعار ہمارا بھی ہونا چاہئے۔

والسلام
پرویز

موضوعات کنونشن-95

1- اساسِ پاکستان خطرے میں؟
2- ہماری معاشی بیماریوں کا علاج؟
3- تعلیم سے کیا حاصل؟
4- کیا عورتیں بھی انسان ہیں؟
5- حفاظتِ جان و مال ہمارا بنیادی حق؟

مقالے بھجوانے کی آخری تاریخ 30 ستمبر 95

منتخب مقالاجات شائع کئے جائیں گے۔ مقرر کو اپنے مقالے کے اہم نقاط پیش کرنے اور ان پر سوال و جواب کے لئے 20 منٹ دیئے جائیں گے۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر عبدالودود

موت کا اِک دن معیّن ہے؟

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ...(3:145)

"کسی شخص میں یہ طاقت نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے' اس نے موت کا وقت مقرر کر رکھا ہے"۔

استاذِ محترم پرویزؒ مرحوم کے ساتھ قرآنی آیت پر میری گفتگو جاری رہتی تھی۔ اس میں یہ دلچسپ مسئلہ بھی زیر بحث آیا کرتا تھا کہ آیا اِنسانی موت صرف Cause and Effect کا مسئلہ ہے یا اس کے علاوہ بھی اس پر اللہ تعالیٰ کا براہ راست کنٹرول ہے۔ آیت زیر بحث (3:145)- ہوتی تھی جو کہ میں نے اوپر درج کی ہے۔ پرویزؒ مرحوم کا نظریہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کا بڑھنا یا گھٹنا Cause and Effect کا مسئلہ ہے کون کتنی عمر جیتا ہے اور کس کی عمر میں کمی آجاتی ہے یہ اللہ کے مقرر کردہ قانون طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر قانون طبعی کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو عمر بڑھ جاتی ہے اور اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو عمر گھٹ جاتی ہے۔ لیکن میرا نظریہ قدرے مختلف تھا اور وہ یہ تھا کہ یہ درست ہے کہ زندگی کی مدت کا انحصار طبعی قوانین کے مطابق زندگی گذارنے پر ہے لیکن یہ نظریہ حادثاتی موت پر لاگو نہیں ہوتا اور اپنے نظریہ کی تائید میں خود اپنی گذشتہ زندگی کے واقعات پیش کرتا تھا اور وہ یہ تھے۔

1- نویں جماعت بعمر 16 سال مجھ پر ٹائیفائڈ بخار کا حملہ ہوا۔ یہ 1922ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں Antibiotic دوائیاں تو ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئی تھیں' اس کے علاوہ بھی مرض کا کوئی مؤثر علاج نہیں تھا۔ اکثر لوگ اس مرض سے مر جاتے تھے۔ حملہ شدید قسم کا تھا لیکن میں بچ نکلا۔ کہا جا سکتا ہے کہ میرے جسم میں اس قدر قوتِ مدافعت تھی کہ مرض کا مقابلہ کر سکا۔ چنانچہ یہ موت سے بچاؤ طبعی قوانین کے مطابق ہی تھا۔ اب آگے بڑھئے۔

2- غالباً 1935ء کا واقع ہے کہ میں اس وقت M.B.B.S. کا امتحان پاس کر چکا تھا اور جالندھر شہر میں پریکٹس شروع کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ایک روز جالندھر سے پھگواڑہ جانے کے لئے ریلوے سٹیشن پر آیا۔

اس زمانے میں ریل کار نئی نئی چلی تھیں اور ان کا ایک ہی ڈبہ ہوا کرتا تھا۔ سواری کے لئے پاؤں رکھنے کے لئے سیڑھی کے پھٹے بہت تنگ ہوتے تھے اور گاڑی سٹارٹ ہونے کے بعد ایک دم سپیڈ پکڑ لیتی تھی۔ میں جب ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر آیا تو گاڑی سٹارٹ ہو چکی تھی۔ میرے اور گاڑی کے درمیان فاصلہ معمولی تھا اور میں تیز دوڑنے کا عادی تھا۔ 100 گز اور 220 گز کی دوڑوں میں اکثر حصہ لیا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے گاڑی پکڑنے کے لئے دوڑ لگا دی۔ اتفاق سے بائیں ہاتھ میں چھڑی اور ریلوے ٹکٹ تھا اور صرف دایاں ہاتھ خالی تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے گاڑی کا ہینڈل پکڑ کر پاؤں پھٹے پر رکھ دیئے لیکن گاڑی کی رفتار تیز ہو چکی تھی چنانچہ میری ٹانگیں لٹک کر گاڑی اور پلیٹ فارم کے درمیان آگئیں ٹانگیں کٹی تو نہیں لیکن بری طرح زخمی ہو گئیں۔ ڈرائیور نے پھرتی کے ساتھ گاڑی کو روک لیا اور میں سوار ہو گیا۔ پھر دیگر مسافروں کی بولیاں سننے میں آئیں۔ ایک کہتا تھا لکھا پڑھا آدمی ہے اس نے یہ کیا حماقت کی ہے دوسرا بولا جناں تھا جناں (جناں پنجابی میں جوان کو کہتے ہیں) اگر کمزور ہوتا اور دایاں ہاتھ چھوڑ دیتا تو بس ختم تھا۔ پھر ایک شخص میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا کہ 5 روپے دے دو۔ تم کو ایسی دوائی دیتا ہوں جس سے زخم 3 روز میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر بچ نکلنا طبعی قانون کے مطابق نہیں تھا اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ تھا اور اس نے مجھے مرنے کی اجازت نہ دی۔

3- فوج میں ملازمت کے زمانے میں ایک بٹالین کے ساتھ وابستہ تھا۔ ایک روز بٹالین کا دریا پر Raft ٹریننگ کے لئے گئی ہوئی تھی۔ Raft سے مراد چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہوتی ہیں جو خود تیار کر کے ان سے ندی نالے وغیرہ پار کئے جاتے ہیں جہاں پر ہم موجود تھے وہاں دریا کا ایک کنارہ کم از کم 20 فٹ اونچا ہو گا۔ دن کے 11 بجے تھے۔ یہ سپاہیوں کے کھانا کھانے کا وقت تھا۔ کچھ سپاہی دریا سے باہر آگئے تھے کچھ ابھی اندر تھے۔ میں بھی ایک Race Boat لے کر دریا کے اندر چلا گیا تھا۔ میں تیراک تو نہیں تھا لیکن ہر کام کے لئے حوصلہ کر بیٹھتا تھا۔ جب میں پانی سے باہر نکلنے کے لئے کنارے کے قریب آیا تو پانی کا بہاؤ یکدم تیز ہو چکا تھا۔ اگر صرف اور دو منٹ پانی کے اندر رہتا تو پانی کے تند و تیز ریلے میں بہ جاتا یقینی امر تھا' سپاہی کئی پانی کے اندر رہ گئے اور بہ گئے۔ رسے اور کشتیاں پانی میں پھینک کر ان کو نکالنے کی کوشش کی گئی لیکن ہر کوشش بے کار تھی۔ کچھ سپاہی پانی کے اندر اونچی جگہوں پر کھڑے ہو گئے' پانی پہلے ان کے ٹخنوں تک آیا پھر اونچا ہو کر بہا کر لے گیا۔ جو کنارے پر تھے وہ بے بسی کے عالم میں یہ منظر دیکھتے رہے۔ پانی کا بہاؤ اس قدر تیز اور خوفناک تھا کہ چند منٹ میں بلا مبالغہ دس فٹ کے قریب اس کی سطح اونچی ہو گئی۔ ایک کنارہ کافی اونچا ہونے کی وجہ سے باقی لوگ بچ گئے۔ لفٹیننٹ اسلم جو کہ جسٹس دین محمد (بونڈری کمیشن والے) کے

بھتیجے تھے وہ بھی دیکھتے دیکھتے آنکھوں کے سامنے پانی میں بہ گئے۔ بہت کم لاشیں اگلے روز مل سکیں۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ نہیں تھا کہ میں پانی میں بہ جانے سے صرف ایک دو منٹ پیشتر پانی سے باہر آچکا تھا۔

4- اب دوسری جنگ عظیم کے واقعات کی طرف آیئے جب میں انڈین میڈیکل سروس میں تھا برما میں دریائے اپراوی کے مغربی کنارے پر دریا سے قریباً دو میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی تھی جس پر قبضہ کرنا تھا۔ بریگیڈ میں British Battalion گورا سپاہیوں کی ایک بٹالین تھی جس کے ذمہ ایک پہلو سے جاپانیوں کے حملہ کو روکنا تھا اور یہ بٹالین ایک شام پہلے اس Flank پر متعین کر دی گئی تھی۔ یہ بٹالین ست بیٹھی رہی اور اپنے فرائض کو نہ نبھا سکے۔ اگلی صبح جب ہماری راجپوتانہ رائفلز پہاڑی کی طرف بڑھی تو جاپانیوں نے فائر کھول دیا۔ جس جگہ سے ہم گذر رہے تھے یہ کھلا میدان تھا صرف اس میں اونچی گھاس تھی۔ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے کئی سپاہی گولیاں لگنے سے گرتے گئے۔ لیکن میں بچ نکلا اور ایک بھاری بم سے زمین میں دس فٹ گہرا Crator گڑھا پڑا ہوا تھا اس میں داخل ہو گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ گولیوں کی بارش میں گھرے ہوئے اور کئی لوگ کیوں مر گئے اور میں کیسے بچ گیا۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ نکلتا ہے کہ میری حفاظت خود اللہ تعالیٰ نے کی۔

5- برما میں ایک مقام پر ایک پہاڑی تھی جس کا نام Peer Hill تھا وہاں پر جاپانیوں کے ساتھ مقابلہ اتنا سخت تھا کہ یہ لڑائی تاریخی حیثیت حاصل کر گئی تھی۔ پہاڑی کے اوپر ایک Pagoda تھا اور اوپر جانے کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا جو سیڑھیوں کے ذریعہ تھا۔ ہماری بٹالین کی ایک کمپنی پہاڑی کے اوپر پہنچ کر پوزیشن لینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جاپانی روزانہ اس پر حملہ کرتے تھے اور سینکڑوں لاشیں چھوڑ جاتے تھے۔ پہاڑی سے کچھ فاصلے پر بٹالین ہیڈ کوارٹر تھا۔ ڈاکٹر کی جگہ ہیڈ کوارٹر میں ہوتی ہے۔ زمین کے اندر گہرے گڑھے کھود کر اور لکڑی کی عارضی چھت بنائی جاتی تھی جسے بنکر کہتے ہیں۔ میرا بنکر بٹالین کمانڈر کے نزدیک ہی تھا۔ ایک روز میں اٹھ کر بٹالین کمانڈر کے بنکر میں چلا گیا اور میرے اپنا بنکر چھوڑنے کے صرف دو منٹ بعد ایک بم کا ٹکڑا میرے بنکر پر آگرا۔ اس ٹکڑے میں اس قدر حدّت تھی کہ میری رائفل جو بنکر میں پڑی تھی اس کے ساتھ ٹکرانے سے رائفل کی بیرل پگھل گئی۔ میرے میڈیکل بیگ کے اندر ایک قرآنِ مجید کا نسخہ پڑا تھا۔ یہ بھی بچ گیا۔ یہ نسخہ میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ نہ تھا کہ بنکر سے جلد باہر نکلو یہاں دو منٹ بعد بم گرنے والا ہے۔

6- فوج سے Release ہونے کے بعد میں جالندھر شہر میں اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ چکا تھا کہ چند ماہ

بعد ملک کی تقسیم شروع ہو گئی اور شہر میں قتل و غارت اور مکانوں کو آگ لگنی شروع ہو گئی۔ اسی اثنا میں' میں نے گھر والوں کو ایک ٹرک میں سوار کر کے لاہور بھیج دیا تھا۔ (یہ ٹرک میں بھیجنے کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے لیکن اس کا میرے زیر بحث موضوع کے ساتھ تعلق نہیں اس لئے اسے حذف کرتا ہوں)۔ میں شہر چھوڑ کر جالندھر چھاؤنی چلا گیا تھا۔ وہاں پر ریفیو جی کیمپ تھا لیکن میں نے ایک خالی بنگلے میں اپنے لئے جگہ تلاش کر لی تھی۔ رات وہاں قیام کرتا تھا اور دن کے وقت خلق خدا کی کیمپ میں خدمت کرتا تھا۔ اسی طرح قریباً ایک ماہ وہاں گذر گیا۔ مولوی عماد الدین مرحوم میرے عربی کے استاد بھی اپنی پردہ دار بیوی کے ہمراہ ریفیو جی کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ میں ہر وقت فوجی لباس میں رہتا تھا۔ خاکی قمیض' نیکر اور ہیٹ۔ کوئی مجھے پہچانتا نہیں تھا سوائے پرانے چند ہندو شہریوں کے' اور نہ کسی کو دوسروں کی طرف توجہ دینے کی فرصت تھی۔ میں چھاؤنی سے نکل کر شہر کا چکر بھی لگا لیا کرتا تھا۔ میرے پاس کچھ رقم تھی جو کہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ کیونکہ میں اپنے علاوہ گرے پڑے اور اُجڑے ہوئے مسلمانوں کے لئے دوائیاں فراہم کرنے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ چنانچہ مین نے ارادہ کیا کہ پنجاب نیشنل بنک سے کچھ رقم نکلوا لوں۔ جالندھر شہر میں یہ واحد بنک تھا اور خالص ہندوؤں کا تھا۔ ڈاکٹر جگن ناتھ آئی سپیشلسٹ میرے پڑوسی تھے اور لاہور اور جالندھر دونوں جگہوں ہی ان کا کلینک تھا۔میں نے ڈاکٹر جگن ناتھ سے کہا کہ میری مدد کریں اور بنک کے ہندو مینجر سے کہہ کر مجھے کچھ رقم دلوا دیں۔ چنانچہ میں اور ڈاکٹر جگن ناتھ ایک روز ریلوے روڈ پر جہاں بنک تھا گئے۔ دونوں سائیکلوں پر سوار تھے اور اتفاق سے ڈاکٹر صاحب بھی میری طرح خاکی نیکر پہنا کرتے تھے۔ شہر میں ہُو کا عالم تھا۔بنک میں پہنچ کر رقم لی اور کچھ پیسے میرے پاس پہلے موجود تھے۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔اس بنک میں اتفاق سے جو مسلمان آجاتا تھا ہندو اور سکھ اس کو پکڑ کر زندہ جلا دیتے تھے۔کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ جس وقت ہم بنک کے اندر موجود تھے اس وقت ہندو کلرکوں نے تین سکھوں کو آگاہ کیا جو باہر گھات میں بیٹھے تھے کہ ان دونوں میں سے ایک مسلمان ہے چنانچہ جب ہم دونوں باہر نکل کر سائیکلوں پر سوار ہوئے تو تین سکھ لمبی لمبی کرپانیں لے کر ہمارے پیچھے بھاگے۔ میں ان دنوں نیا نیا لڑائی کے میدان سے واپس آیا تھا اور رات دن گولیوں' بموں کے ٹکڑوں اور بے پناہ شور و شر کے اندر ایک لمبی مدت گزارنے کی وجہ سے میرے اندر اللہ پر بھروسہ' حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں بھاگنے اور اپنا سائیکل تیز کرنے کی بجائے سائیکل سے اتر کر ان کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور حیران کن بات یہ تھی کہ انہوں نے ہم پر حملہ نہ کیا اور ہم دوبارہ سائیکلوں پر سوار ہو کر چل دیے۔ کیوں حملہ نہ کیا؟' ہو سکتا ہے کہ سکھوں نے یہ سمجھا کہ اس فوجی کے پاس پستول ہے۔ یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ پہچان نہ سکے کہ ان

دونوں میں مسلمان کون ہے؟ بہرحال یہ ایک معجزہ تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کی مدد کے کو
دوسرا سہارا نہ تھا۔ ڈاکٹر جگن ناتھ بڑی عمر کا تھا اور بے حد ڈرا ہوا تھا۔ بہرحال ہم ڈاکٹر صاحب کے کلینک
میں پہنچ گئے۔ وہاں کچھ دیر انتظار کیا لیکن کچھ نہ ہوا۔ میرے استاد مولوی عماد الدین مرحوم کا ایک چھوٹا
پریس بھی تھا انہوں نے مجھے کہا تھا کہ اگر کسی وقت شہر جانا ہوا تو دیکھنا میرے پریس کا کیا حال ہے؟ چنانچہ میں
ڈاکٹر جگن کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مولوی صاحب کے مکان کی طرف گیا۔ دیکھا کہ سکھ پریس اور کاغذ اکھاڑ
کر اور سائیکلوں پر لاد کر لے جا رہے ہیں اب میں شہر سے چھاؤنی میں اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ سڑک
ویران تھی جب کمشنر کی کوٹھی کے پاس پہنچا تو ایک سکھ چھاؤنی سے شہر کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ جو کہ
سائیکل پر سوار تھا۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ مشکوک ہے جب وہ قریب آیا تو میں نے اسے ست سری اکال،
کہا اور سائیکل سے اتر کر اس سے ہاتھ ملایا اس نے میرا نام پوچھا میں نے کوئی ہندو نام بتا دیا۔ اور پھر میں
نے پوچھا کہ سردار جی اس وقت کہاں سے آرہے ہیں۔ سکھ حیران ہوا اور جواب دیا کہ ایک مسلمان کچھ وقت
پہلے نیشنل بنک سے پیسے نکلوا کے نکلا تھا۔ میں اس کی تلاش میں گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ سکھ کے بارہ بج
چکے ہیں۔ ہاتھ ملایا اور اپنے سائیکل پر سوار ہو گیا۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ شہر کے ہندو ڈاکٹروں میں مشہور ہو
گیا کہ ڈاکٹر وودود آج پھر بچ کے نکل گیا ہے۔ میری کہانی بہت طویل ہے لیکن میں نے اسے بہت مختصر بیان
کیا ہے۔ الغرض یہ وہ حالات ہیں جن میں سے میں گذر چکا ہوں۔

اب پھر اصل موضوع کی طرف لوٹئے۔ ایک نظریہ ہے کہ "کون کتنی لمبی عمر تک جیتا ہے اس کا
انحصار قوانین طبعی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے۔ جو ان کے مطابق زندگی بسر کرے گا اس کی عمر بڑھ
جائے گی جو ان کی خلاف ورزی کرے گا اس کی عمر گھٹ جائے گی۔ از روئے قرآن یہ نظریہ درست ہے لیکن
اس کے علاوہ یہ بھی قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

مَا كَانَ لِنَفْسٍ اِنْ تَمُوْتَ بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا " (3:145)۔

کسی میں یہ طاقت نہیں کہ خدا کے اذن کے بغیر مرجائے۔ اس نے موت کا وقت مقرر کر رکھا ہے"۔

اس آیت میں لفظ 'اذن' آیا ہے اور استاذ مرحوم نے اس کا ترجمہ 'قانون' کیا ہے۔ اور وہ اس کی تائید
میں وہ مختلف آیات پیش کرتے تھے۔ مثلاً **يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ**
(22:65)

"وہ آسمان (بارش) کو تھامے رکھتا ہے کہ اس کے اذن کے بغیر نہ گرے"

استاذ مرحوم کے مطابق یہاں اذن سے مراد قانون ہے۔ اسی طرح ان کے مطابق سورۃ (3:145)۔ ارب

ہاء ارب آسمانی کرے ہیں لیکن کوئی کسی سے نہیں ٹکراتا۔ لیکن اگر کوئی ٹکراؤ ہوتا بھی ہے تو وہ بھی قانون کے مطابق۔ بہرحال حالیہ موضوع میں بھی اذن کے معنی قانون ہے۔ لیکن مفسرین نے جو آیت (3:145)- کے معنی کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

"And no soul can die but
With Allah's Permission. The Term is fixed"
(Maulana Muhammad Ali)
"Nor can a soul die except by Allah's leave
The term being fixed as in writing"
(Abdullah Yousaf Ali)

(نوٹ) یہاں سماء کے معنی بادل یا بارش کرنا بھی درست نہیں۔ یہ آیت آسمانی کروں کے باہمی ٹکراؤ کے متعلق ہے۔

"کسی میں طاقت نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر مرجائے۔ اس نے موت کا وقت مقرر کر رکھا ہے"۔ (مولوی فتح محمد جالندھری)

"اور کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں بدوں حکم خدا کے۔ اس طور سے اس کی معیاد معین لکھی ہوئی رہتی ہے"۔ (مولانا اشرف علی تھانوی)

کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مرسکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ (مولانا مودودی)

اس آیت میں مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا مقصود تھا کہ موت کے خوف سے تمہارا بھاگنا فضول ہے۔ کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کئے ہوئے وقت سے پہلے مرسکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے۔ (مولانا مودودی)

چنانچہ دو مختلف نظریات سامنے آگئے۔ (1) موت صرف طبعی قوانین کے مطابق واقعہ ہوتی ہے (2) موت اللہ کے اذن کے بغیر نہیں آسکتی موت کا وقت اللہ نے مقرر کر رکھا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر 'اذن' کے معنی قانون ہے تو ان واقعات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو میں نے اپنی زندگی کے حادثات کے طور پر بیان کئے ہیں؟ میں ان حالات میں کیونکر بچ گیا جب کہ موت عین سامنے کھڑی تھی؟۔

قارئین طلوع اسلام سے گذارش ہے کہ اگر کوئی صاحب اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنا چاہیں تو مشکور ہوں گا۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

بشیر احمد عابد (کویت)

سماجی عمل میں قول و فعل کا تضاد

اللہ تعالیٰ کے نزدیک قول و فعل کا تضاد ایک انتہائی ناپسندیدہ فعل ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے:

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (3:166)۔

"یہ لوگ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا"۔ اور جو دل میں ہوتا ہے اسے زبان پہ نہیں لاتے۔ دورِ حاضرہ میں اپنے اس فعل کو سیاست دان ڈپلومیسی سے اور مذہبی حضرات مصلحت بینی سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے نزدیک یہ عمل صریحاً منافقت ہے اور مسلمان کو اس قبیح فعل کے ارتکاب سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ ارشاد ہے:

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (61:3)۔

"قانونِ خداوندی کی رُو سے یہ بات انتہائی مذموم اور قابلِ گرفت ہے کہ ایسی باتیں کہی جائیں جنہیں کر کے نہ دکھایا جائے"۔

قرآنِ کریم کے آغاز میں نوعِ انسان کو اصولی طور پر تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا گروہ اہلِ ایمان کا جو وحی کی صداقتوں کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں اور اسی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ **يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ**۔ یہ لوگ اپنے دعویٰ ایمانی کو سچ ثابت کرنے کے لئے ہمہ وقت تڑپ رہے ہوتے ہیں اور جب کوئی مسیحا انہیں پکارتا ہے۔ **مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ**۔ بولو! اس نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے کون میرا مددگار بنتا ہے؟ تو یہ دیوانہ وار آگے بڑھتے ہیں اور حضرت مسیحؑ کے مخلص حواریوں کی طرح نہایت جرأت و بے باکی سے جواب دیتے ہیں۔ **نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ج اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ج وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ**۔ (3:51)۔ "نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے ہم آپ کے رفیقِ کار بنیں گے۔ ہم اس نظام کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ آپ دیکھ لیں گے کہ ہم اس کی کس طرح اطاعت کرتے ہیں"۔ اس اقرار کے بعد ان کی زندگیاں اس نظام کی صداقت کی جیتی جاگتی شہادت

بن جاتی ہیں۔

دوسرا گروہ کُفّار کا ہے جو کُھلّم کُھلاّ وحی کی صداقتوں سے انکار کرتا ہے۔ قرآنِ کریم انہیں ضدی اور ہٹ دھرم قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی سب سے بڑی نفسیاتی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ یہ بات کو سنتے ہی نہیں۔ کہا **وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا** ط (7:198)۔ "اور جب اِنہیں ہدایت کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو یہ بات سنتے ہی نہیں!"

اِن کی اِس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالفاظِ قرآن کریم۔ **خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ** ط **وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ** ط۔ ان میں دیکھنے بھالنے' اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر نہ تو نصیحت کا کچھ اثر ہوتا ہے اور نہ تنذیر کا! ان کا رویہ اس قدر غیر محتاط اور غیر ذمہ دارانہ ہوتا ہے کہ جب کوئی رسول ان لوگوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا ہے تو یہ انتہائی ڈھٹائی سے اس کا منہ چڑاتے ہیں اور کہتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (8:32)۔

"اے اللہ! اگر یہ وعید فی الواقعہ تیری طرف سے ہے اور سچی ہے' تو پھر تجھے انتظار کس بات کا ہے؟ تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا دے یا ہمیں کسی اور عذاب میں مبتلا کر دے"۔

ایک پکّے اور سچّے مومن کی طرح یہ بھی پکّے اور سچّے کافر ہوتے ہیں بالفاظِ دیگر ایمان اور کفر میں ایک قدرِ مشترک ہوتی ہے اور وہ قلب و زبان میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ایمان میں حق و صداقت کے لئے ہم آہنگی اور کفر میں باطل کے لئے ہم آہنگی۔ لیکن جب قلب و زبان میں ہم آہنگی نہ ہو تو ایسا شخص نہ مومن رہتا ہے اور نہ کافر' اسے قرآن کی اصطلاح میں منافق کہا جاتا ہے اور یہی وہ تیسرا گروہ ہے جو ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے۔

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔ **وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** (2:8)۔ "یہ لوگ زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے' لیکن وہ درحقیقت ان پر ایمان نہیں رکھتے"۔ ان کے دعویٰ ایمانی کو قرآن نے اس لئے تسلیم نہیں کیا کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ یہ لوگ یا تو سطحی جذبات پرست ہوتے ہیں اور یا ابن الوقت اور موقعہ پرست! اور اس روش کو نبھانے کے لئے انہیں قدم قدم پر جھوٹ بولنا اور ہر موقعہ پر نیا بہروپ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں واضح

۔ **يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (2:9)- یہ دھوکے باز ہوتے ہیں- خدا اور جماعتِ مومنین کو دھوکہ
ہیں- دو رُخی چالیں چلتے ہیں- کہتے کچھ اور ہیں کرتے کچھ اور ! دھوکے کے لئے قرآنِ کریم یہاں
ع" کا لفظ لایا ہے جو کہ بڑا ہی معنی خیز ہے اور اس گروہ کی نفسیات کی مکمل عکاسی کرتا ہے- اس مادہ (خ-
ع) کے بنیادی معنی ہیں- جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کرنا- کسی کے ساتھ چھپ کر برائی کرنا-
صورؐ کے دور میں، عرب اس لفظ کو جس مخصوص انداز میں استعمال کرتے تھے، اس سے اس کے معانی اُبھر
ر سامنے آجاتے ہیں- عربوں کی شہرت اور شرافت کا مدار مہمان نوازی پر تھا- وہ صحراؤں میں رہتے تھے-
ن کے ہاں مویشیوں کا دُودھ اور گوشت ہی بر وقت میسّر آنے والی چیز ہو سکتا تھا، جس سے مہمان کی تواضع
ی جا سکتی تھی- چنانچہ وہ آنے والے مسافر کے سامنے بالعموم دُودھ پیش کیا کرتے تھے- اب ذرا سوچئے کہ
کر ایسا ہو کہ مہمان خیمہ میں آجائیں، دُودھ دینے والی اُونٹنی باہر بندھی ہو- میزبان دودھ دوہنے کے لئے
جائے اور اُونٹنی دودھ چڑھا جائے تو اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی- وہ اس قسم کی اونٹنی کو "خدوع" کہتے
تھے- اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ منافق، اس پارٹی کو جس میں وہ شامل ہو، کس طرح دھوکہ دیتا ہے- یعنی
وہ انتہائی ناقابلِ اعتماد ہوتا ہے- اس کے متعلق کہا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ کب دھوکا دے جائیگا- اسی طرح وہ
اس راستے کو "خیدع" کہتے تھے جو بظاہر معلوم ہو کہ منزل کی طرف لئے جا رہا ہے، لیکن حقیقت اس کے
خلاف ہو- اسی طرح وہ سراب کو بھی "خیدع" کہتے تھے- نیز اس دینار کو "خادع" کہتے تھے جو دیکھنے میں کھرا
معلوم ہو لیکن پرکھنے پر کھوٹا ثابت ہو- "سوق خادعة" اس بازار کو کہتے تھے، جس میں اشیاء کے نرخ
ہر آن بدلتے ہوں- ابھی کچھ ! ابھی کچھ ! اس لفظ کے ان معانی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ
منافقین کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، اور وہ سوسائٹی کے لئے کس طرح تخریب اور تباہی کا موجب بنتے ہیں-
خود لفظ "منافق" بھی اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے- عربی لُغت کی رُو سے "نفق" اس سرنگ کو کہتے ہیں
جس کے داخل ہونے اور باہر نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں- اس سے ظاہر ہے کہ منافق اس شخص کو کہا
جائیگا جو کسی نظام یا سوسائٹی، یا عہد و پیمان میں داخل ہونے سے پہلے ہی یہ دیکھ لے کہ اس میں سے نکلنے
کے لئے چور دروازے کون کون سے ہو سکتے ہیں- منافق کبھی بھی اپنے قول و فعل میں مخلص نہیں ہوتا-
دھوکے باز ہوتا ہے- یہ لوگ نظامِ خداوندی اور اس کے قائم کرنے والی جماعت سے دو رُخی چالیں چلتے ہیں
اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں فریب دے رہے ہیں- لیکن قرآن کریم کے مطابق **وَمَا يَخْدَعُوْنَ
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ** (2:9)- اگر یہ عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ وہ
خود اپنے آپ کو فریب میں رکھ رہے ہیں- کسی اور کو نہیں ! خدا کو دھوکا اس لئے نہیں دے سکتے کہ وہ ایسا

علیم و خبیر ہے کہ دلوں میں گذرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانتوں تک سے واقف ہے۔ (40:19)۔ اس لئے اسے کون دھوکا دے سکتا ہے۔ جماعتِ مومنین کو اس لئے دھوکا نہیں دے سکتے کہ قرآنِ کریم نے' مختلف مقامات پر منافقین کی ایسی علامات بیان کی ہیں کہ جن کی روشنی میں کوئی بھی آنکھیں رکھنے والا ان سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ وقتی دھوکے کی بات اور ہے' لیکن ایسے لوگ مستقل طور پر اصحابِ عقل و شعور کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

اب رہا یہ کہ یہ اپنے آپ کو کس طرح دھوکا دیتے ہیں تو اس کے لئے قرآنِ کریم نے ایک ایسی جامع اور عمیق اصطلاح استعمال ہے کہ جس پر جب انسان دورِ حاضرہ کے علم النفس (سائیکالوجی) کی روشنی میں غور کرتا ہے تو نگاہِ بصیرت وجد میں آجاتی ہے اور اسے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے :۔ **فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ** (2:10)۔ "ان کے دلوں میں مرض ہے"۔ قرآنِ کریم کے مطابق منافق ایک ایسا نفسیاتی مریض ہوتا ہے جس کے اسباب و علل تک اس کا شعور نہیں پہنچ سکتا۔ یہ مرض نفسیاتی ہے لہٰذا اس کا علاج بھی نفسیاتی طور پر ممکن ہے۔ قرآنِ کریم نے اپنے متعلق کہا ہے کہ یہ : **شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ** (10:57) ہے۔ "اس میں سینوں کے روگ کی شفاء کا سامان ہے"۔ منافق لوگ حق و صداقت کی بجائے جذبات پرستی اور فریب کاری کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں اور اس زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا قلب و دماغ صحت مندانہ توازن کھو بیٹھتا ہے اور خدا کا قانون یہ ہے کہ غیر متوازن ذہن جس قدر مصروف کار رہے گا' اسی قدر اس کا توازن مزید بگڑتا جائے گا۔

انسان کے قول و فعل میں تضاد معاشرتی ترقی اور استحکام کے لئے زبردست نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ معاشرے کا تار و پود باہمی اعتماد اور تعاون سے ترتیب پاتا ہے اور قول و فعل کا تضاد اس کو اُدھیڑ کو رکھ دیتا ہے۔ ذرا غور کیجئے' آپ کو ایک مسئلہ درپیش ہے۔ اس سلسلے میں آپ ایک ذمّہ دار شخص سے ملتے ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ اسے اپنی مشکل سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ شخص آپ کی ایک ایک بات کو غور سے سنتا ہے۔ آپ سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہے۔ آپ وہاں سے مطمئن ہو کر لوٹتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس اب آپ کی مشکل حل ہو جائے گی۔ لیکن آپ کے چلے آنے کے بعد وہی شخص آپ کی برائیاں شروع کر دیتا ہے اور آپ کا کام نہیں کرتا۔ کیا ایسی صورت میں یقین اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسا معاشرہ' جس میں منافقوں کی اکثریت ہو' بظاہر کتنا ہی مضبوط و مستحکم کیوں نہ دکھائی دے۔ اندر سے بالکل کھوکھلا ہوتا ہے اور مخالف آندھی کا ایک معمولی سا جھونکا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کو بھی یہی نفسیاتی بیماری لاحق ہے۔ ہمارے بھائی بند سامنے ہوں گے تو نہایت

خوش اخلاق' ملنسار' اور مسکراہٹ سے کھلے ہوئے چہرے کے ساتھ ملیں گے ! لیکن پیٹھ پھیرتے ہی آپ کی غیبت شروع کر دیں گے۔ دنیا کا کوئی کام ہو' ان سے کہئے' یہ پورا کرنے کا پکا وعدہ کریں گے۔ لیکن ایسا کریں گے نہیں ! عام آدمی تو ایک طرف ہمارے اربابِ اقتدار و اختیار کا بھی یہی حال ہے۔ الیکشن کے دنوں میں ایسا بہروپ اختیار کریں گے کہ اِن جیسا دنیا میں کوئی غریب نواز اور بندہ پرور انسان ہے ہی نہیں ! عوام کے مسائل و مشکلات کی ایسی درد ناک تصویر پیش کریں گے کہ جیسے وہ خود ان کا شکار ہو چکے ہوں۔ لیکن اقتدار سنبھالتے ہی وہ یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ پھر یہی عوام کے ہمدرد' مخلص' عاجز اور مسکین بندے جب اقتدار کے ایوانوں سے باہر نکلتے ہیں تو ایسے لگتے ہیں جیسے دُلہن بیوٹی پارلر سے نکلی ہو۔ دُلہن جب مائیوں بیٹھتی ہے تو اس کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جب بناؤ سنگھار کیا جاتا ہے تو اس کا حُسن خوب نکھرتا ہے۔ اسی طرح ہمارے حکمرانوں پر بھی اقتدار کا رنگ خوب نکھرتا ہے۔ جب یہ چمکتی دمکتی لمبی لمبی امپورٹیڈ گاڑیوں میں بیٹھ کر شہر کا رخ کرتے ہیں تو ہر طرف ایک عجیب سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر چیز ان کے ادب و احترام میں باادب۔ باملاحظہ۔ جہاں ہوتی ہے وہیں رک جاتی ہے اور یہ اپنے آگے پیچھے' دائیں بائیں شور مچاتی حفاظتی گاڑیوں کے جلو میں چلے آرہے ہوتے ہیں۔ عوام انہیں یوں حیرت زدہ ہو کر دیکھتے ہیں جیسے شہر میں یو۔ ایف۔ او (U.F.O) اُتر آئی ہوں۔ عوام اور ان کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج پیدا ہو جاتی ہے اور یہ قول و فعل کے تضاد کا بے مثال نمونہ بن جاتے ہیں۔

انسان کے قول و فعل میں تضادٗ غلط معاشرتی نظام کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک غلط معاشرتی نظام کا بنیادی خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں انسان کی ضروریات کو پسِ پشت ڈالدیا جاتا ہے۔ اصولوں کی جگہ جذبات پرستی لے لیتی ہے اور مفادِ عاجلہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ انسان کو اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے بھی بددیانتی' خیانت اور جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ پہلے پہل ایسا بامرِ مجبوری ہوتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی کیفیت مستقل نفسیاتی روگ بن جاتی اور پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ہے۔ اس کی تمام جائز ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور اس کے تمام کام خوش اسلوبی سے سرانجام پا رہے ہیں۔ کوئی رخنہ اندازی نہیں ! کوئی رکاوٹ درپیش نہیں ! ایسی صورت میں وہ کیونکر بددیانتی کرے گا؟ کسی کو کیونکر رشوت دے گا؟ وہ یہ قبیح فعل تو اس وقت بھی نہیں کرے گا جب کوئی چھوٹی موٹی مشکل بھی سامنے آجائے۔ لیکن جب اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہو گا تو پھر اس کے لئے ان ذمائم و عیوب سے بچنا محال ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنی طبیعی زندگی کے تقاضے بہرحال پورے کرنے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں کو وہ قربان کر سکتا ہے لیکن اس صورت میں جبکہ اس کے سامنے زندگی کا اعلیٰ تصوّر ہو گا۔ قرآنِ کریم کی

اصطلاح میں اسے اللہ اور آخرت پر ایمان کہا جائے گا۔ معاشرے میں نہ تو نظام درست ہو اور نہ ایمان کا تصوّر درست ہو تو پھر تو لوگوں کے قول و فعل میں تضاد ضرور پیدا ہو گا خواہ اسے زمانہ کتنا ہی معیوب کیوں نہ سمجھے۔

ایک صالح معاشرتی نظام کا بنیادی خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے معاشرے میں باہمی اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ہر فرد دوسرے فرد کا ممد و معاون ہوتا ہے۔ لوگوں کو حق بات کہنے اور اپنے حقوق کے حصول میں ذرّہ بھر دُشواری نہیں ہوتی۔ لہٰذا' ایسے نظام میں لوگوں کیلئے قول و فعل میں مطابقت پیدا کرنا آسان ہوتا ہے۔

موجودہ دَور میں کہیں بھی ایسا نظام قائم نہیں ہے۔ رائج الوقت جتنے نظام بھی ہیں' وہ سب انسانی عقل کے تراشیدہ نظام ہیں۔ انسانی عقل میں دو بنیادی کمزوریاں ایسی ہیں کہ جن کی بنا پر کوئی انسان بھی ایک صالح معاشرتی نظام تشکیل نہیں دے سکتا۔ حتیٰ کہ کئی انسان مل کر بھی ایسا کام سرانجام نہیں دے سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ذمّہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اٹھائی ہے اور ایک مکمل ضابطۂ حیات بذریعہ وحی عطا کیا ہے۔ انسانی عقل کی پہلی کمزوری یہ ہے کہ یہ مفادِ خویش سے بلند ہو کر سوچ ہی نہیں سکتی اور اس کی دوسری بڑی کمزوری یا خامی یہ ہے کہ اس کی نگاہ دُور رَس نہیں ہوتی۔ یہ انسان کے ان اعمال کے نتائج کا اِدراک نہیں کر سکتی جو ہنوز نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور یہ دونوں خامیاں صحیح فیصلہ کرنے میں مانع ہیں۔ صحیح فیصلہ صرف خدا کی ذات کر سکتی ہے۔ اس لئے کہ ایک تو اسے اپنی تمام مخلوق کا مفاد عزیز ہے اور دوسرا یہ کہ وہ علیم و خبیر ہے' یعنی اس کے حیطۂ علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ اس کی رحمت اور علم کی وسعتیں ہر شے کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ انسانی عقل انسان کے طبیعی زندگی سے متعلق مسائل کا حل تو پیش کر سکتی ہے لیکن تمدنی اور معاشرتی زندگی سے متعلق مسائل کا حل پیش کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جو انبیاءِ کرام بھی بھیجے ان سب نے انسان کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کی۔ ہر نبی نے خدا کے احکام کے مطابق اپنے دور میں ایک خوش حال اور پُرامن معاشرہ قائم کیا۔ اس معاشرہ میں حق و صداقت کا بول بالا ہوتا ہے اور حق بات کہتے کسی کی زبان نہیں تھرتھراتی! انبیاءِ کرام کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے اور لوگوں کی ذہنی تربیت کا سامان کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد دوسرے کا خیر خواہ بن جاتا اور معاشرتی وحدت اور اخوت ایک مثال بن جاتی ہے۔ اربابِ اختیار اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ہر فردِ معاشرہ کی تمام جائز ضرورتیں بطریقِ احسن پوری ہوں۔ عوام کے تمام مسائل خوش اسلوبی سے سرانجام پائیں۔ کسی کے کام میں کوئی رخنہ نہ ڈالے! کوئی رُکاوٹ پیدا نہ کرے! کسی کی حق تلفی نہ ہو! ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کی

رُومندی کا مساوی موقعہ ملے ! اور اس کے مراتب اور درجات کا تعیّن اس کی صلاحیت اور کارکردگی کے مطابق ہو۔ حاکمِ وقت خود گھر گھر جا کر لوگوں کی خبر گیری کرتا ہے۔

آج دُنیا بھر میں اس نوع کا معاشرہ کہیں بھی قائم نہیں۔ ہر طرف نفس پرستی اور مفاد پرستی کا دَور دَورہ ہے۔ لوگ اصول و اقدار کو بطور پالیسی استعمال کرتے ہیں۔ اگر فائدہ ہو رہا ہو تو ہر کوئی بااصول بن جاتا ہے' بصورت نقصان اصول و اقدار دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ مستقبل قریب میں بھی ایسے کسی معاشرے کے قائم ہونے کی اُمید نہیں رکھی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبیٔ اکرمؐ کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے جب معاشرتی بگاڑ اپنی انتہاء کو پہنچ جاتا تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کے لئے ایک نبی بھیج دیتا۔ لیکن ختمِ نبوّت کے بعد ایسی کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔ ختمِ نبوّت کے بعد معاشرتی اصلاح کا واحد ذریعہ قرآنِ کریم کے احکام پر عمل کرنا تھا۔ لیکن مفاد پرست طبقات نے اس کی تعلیمات پر گہرے پردے ڈال رکھے ہیں۔ آج اسلام کے نام پر ہمارے سامنے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس میں قرآنِ کریم کی خالص تعلیمات کا عشرِ عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔ موجودہ مروّجہ اسلام کا بیشتر حصہ مفاد پرست طبقات کے کذب و افتراء پر مشتمل ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جہاں جہاں اسلامی معاشرے ہیں' سب کے اندر طبقاتی کشمکش پائی جاتی ہے اور عوام کی اکثریت غربت' افلاس اور جہالت کا شکار ہے۔ خالص قرآنی تعلیمات کی موجودگی میں ایسی صورتِ حال کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ آپ ذرا غور کیجئے کہ ایک خدا' ایک رسول' اور ایک نظریۂ زندگی کی حامل قوم میں تفرقہ بازی' نسل پرستی' قوم پرستی' وطن پرستی' مادہ پرستی اور نفس پرستی کی کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ سب ذمائم و عیوب مسلمانوں کا امتیازی نشان بن چکے ہیں۔ کیا اس قوم کو حاملِ قرآن قوم کہا جا سکتا ہے؟

قرآنِ کریم نے اس قوم کو بنیانِ مرصوص قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ ان کے دل ایک دوسرے سے جوڑ دیئے گئے ہیں۔ نبیٔ اکرمؐ سے فرمایا کہ اگر تو ارض و سماء کے سارے خزانے لٹا دیتا تو تب بھی ایسی تالیفِ قلوب پیدا کرنا ممکن نہ تھا' لیکن قرآن نے اسے کر کے دکھا دیا ! آج ہماری وہ حالت ہے' جو اُس دَور میں اہلِ کتاب کی تھی۔ کہا اے نبیؐ ! **تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَ قُلُوبُهُمْ شَتّٰى** ۔ دیکھنے کو تو یہ بہت بڑا اجتماع دکھائی دیتے ہیں لیکن دل ان کے اکٹھے نہیں ! آج مسلمانوں کی بعینہٖ یہ کیفیت ہے۔ دیکھنے کو ان کے اجتماعات بھی ایک عظیم اور بے مثال وحدت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ جیسے نماز کا اجتماع' جمعہ کا اجتماع' عیدین کا اجتماع۔ لیکن یہ کاندھے سے کاندھا ملا ہونے کے باوجود' دلی طور پر ایک دوسرے سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ اس منافقت کی واحد وجہ اسلام کے مروّجہ عقائد و نظریات ہیں جو کہ بالبداہت قرآنِ کریم کے اصولوں کے

خلاف ہیں۔ قرآنِ کریم کے اصول دلوں میں محبّت' رحمت' رافت' مؤدت' سکینت اور طمانیت پیدا کرتے ہیں۔ ایمان اور عملِ صالح کو نجات کی بنیاد ٹھہراتے ہیں۔ اللہ اور آخرت پر ایمان کو پُختہ تر بناتے ہیں۔ لیکن اسلام کے مروّجہ عقائد کے اِتّباع سے دل نفرت' بُغض اور حسد کا مسکن بن جاتا ہے۔ لوگ گناہ سے تائب ہونے اور اپنی اصلاح کرنے کی بجائے بخشش کے سہارے ڈھونڈتے ہیں اور جس کو جو سہارا بھی میسّر ہوتا ہے وہ اس کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے عقیدے کو کمزور سے کمزور تر بناتا چلا جاتا ہے۔ آج جس چیز کو اللہ کا دین قرار دیا جاتا ہے۔ وہ دراصل دین کے اصولوں پر عمل کرنے کا طریقہ کار تھا۔ اسے حضورؐ نے اپنے دور میں صحابہ کرامؓ کے باہمی مشورے سے اختیار کیا تھا اور بعد میں اسلامی دانش وروں' علماء اور فقہاء نے اپنی علمی بصیرت اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق تشکیل دیا تھا۔ دین اس وقت' آج اور ہمیشہ ہمیشہ صرف قرآنِ کریم میں ہے اور یہی وہ اٹل اور غیر متبدّل دین ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۭ** (6:116)۔ قرآنِ کریم سے باہر جو کچھ بھی ہے وہ کلماتِ رب نہیں ہے۔ لہٰذا غیر متبدّل نہیں! غیر متبدّل صرف خدا کے دیئے ہوئے احکام واقدار ہیں اور یہی وہ دین ہے جس کے متعلق نبیؐ کو اور آپؐ کے بعد تمام نوعِ انسان کو اتّباع کرنے کیلئے کہا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ الروم کی آیت نمبر30)

یہ مسلمان اقوام کی انتہائی بد نصیبی ہے کہ ان کی نظروں سے قرآنِ کریم اوجھل کر دیا گیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس سے بھی زیادہ بد نصیبی یہ ہے کہ مروّجہ اسلامی عقائد و نظریات کو اس قدر تقدّس عطا کر دیا گیا ہے کہ ایک اچھا خاصہ عالم بھی اس کی خامیوں کے خلاف آواز اُٹھا نہیں سکتا۔ اس کے لئے ہمّت اور جرأت چاہئے' بلکہ انبیاء جیسی سیرت و کردار کی پختگی اور بلندی بھی ہے۔ آج اہلِ اسلام نے قرآن کا وہی حشر کر رکھا ہے جو اہلِ کتاب نے حضورؐ اور دیگر انبیاء اکرامؑ کے ادوار میں اپنی کُتبِ سماوی کا کر رکھا تھا۔ وہ بھی احکامِ خداوندی کی من مانی تاویلیں پیش کیا کرتے تھے اور مسلمان بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں مسلمان ان کی نسبت زیادہ دیدہ دلیر ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ختمِ نبوّت کے بعد اب اُنہیں کوئی چیلنج کرنے والا نہیں۔

اب اس کی ایک ہی صورت باقی ہے اور وہ یہ کہ انسان کی علمی سطح بلند ہو جائے۔ وہ وحیٔ خداوندی کے ابدی حقائق پر جذبات سے بلند ہو کر غور و خوض کر سکے اور حق و باطل میں از خود تمیز کر سکے۔ لیکن فی الحال اس اُمید کی کرن کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔

نہ تو نام نہاد تہذیب یافتہ سیکولر معاشروں میں اس کے آثار نظر آتے ہیں اور نہ کہیں اور! فی الوقت

ہر طرف عقلِ انسانی کا راج ہے۔ جو سراسر جذبات پرستی اور فریب کاری کا دوسرا نام ہے۔ ہر معاشرے میں انسانوں کے وضع کردہ احکام و ضوابط نافذ ہیں جو صرف مخصوص طبقوں کو تحفظات فراہم کرتے ہیں۔ عام انسان کی بھلائی کیلئے ان میں صرف الفاظ ہوتے ہیں۔ یہ احکام و ضوابط ریاستی نظم و نسق سے متعلق ہوں یا مذہبی رسومات ادا کرنے کی شرائع۔ ایک عام انسان اپنے آپ کو ان میں بُری طرح جکڑا ہؤا پاتا ہے۔ ان کے اتّباع سے نہ تو اس کی طبیعی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور نہ ذہنی نشوونما میں کوئی مدد حاصل ہوتی ہے۔ البتہ مخصوص طبقات جن میں سرِ فہرست حکمران' سرمایہ دار' جاگیردار اور مذہبی پیشوا شامل ہیں' وہ اس نظام سے خوب مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہر قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں اور ان کے جبر و استبداد اور عیش پرستیوں کو کسی عدالت میں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے برعکس ایک صالح معاشرتی نظام میں۔ جس کی اساس صرف اور صرف وحیٔ خداوندی کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔ آپ کو حاکم و محکوم' غنی و محتاج' اور عالم و جاہل میں کوئی امتیازی سلوک ہوتا نظر نہیں آئے گا۔ آپ ہر فردِ معاشرہ کو قانون کے رُوبرو سرِ تسلیم خم کیا ہؤا پائیں گے۔ حضرت عمر فاروقؓ ایک عظیم سلطنت کے سربراہ تھے۔ آپ کے دور میں اسلامی مملکت کی وسعتیں حدود ناآشنا ہو چکی تھیں اور مملکت کے خزانے سیم و زر سے مالا مال تھے۔ لیکن اس جاہ و حشمت اور خوشحالی کے باوجود آپ نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا اس پر جگہ جگہ پیوند لگے تھے۔ ایک مرتبہ بیٹے کی چادر اور اپنی چادر ملا کر قدرے بہتر لباس پہن لیا۔ فوراً جواب طلبی ہو گئی ! ایک بدوی نے مسجد میں کھڑے ہو کر سرِعام پوچھا۔ اے عمرؓ! یہ کیسے ممکن ہوا کہ تو نے مجھ سے بہتر لباس زیب تن کر لیا؟ اور عمرؓ کی گلو خلاصی تب ہوئی جب بدوی کو تسلی بخش جواب مل گیا۔ ایسے مخلصانہ کردار اور احتساب کی مثال آج کہاں ممکن ہے؟

اس زمانے میں سرمائے کو بھی صرف اتنی اہمیت حاصل تھی کہ اس سے ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں۔ زائد از ضرورت دولت بیت المال میں جمع کرا دی جاتی تھی تاکہ اسے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ سرمایہ داری کے نظام کے خلاف قرآن نے اعلانِ جنگ کر رکھا تھا۔ لہٰذا مال و دولت کے انبار لگانا ان کی لغت سے خارج تھا۔ اگر معاشرے میں ایک فرد بھی حاجت مند ہوتا تو وہ اپنے پاس' زائد از ضرورت ایک سکّہ رکھنا بھی جُرم سمجھتے تھے اور حاجت روائی کی یہ کیفیت ہوتی کہ فرد اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیتا۔ خود تنگی ترشی میں گذارہ کر لیتا لیکن ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتا۔ حضورؐ کی زندگی اس کا بہترین نمونہ تھی۔ آپ کا اسوۂ حسنہ دنیا کے تمام سرمایہ داروں کیلئے درسِ عبرت ہے اور مسلمان سرمایہ داروں کے منہ پر زنّاٹے دار چانٹا ! اس لئے کہ یہ بدنصیب باوجود حضورؐ کے

اسوۂ حسنہ پر ایمان رکھنے کے ضرورت مندوں پر ایک کوڑی بھی خرچ نہیں کرتے۔ دنیا میں سب سے ابتر معاشی بدحالی کا شکار مسلمان قوم ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان سرمایہ داروں نے دنیا بھر میں اپنے بنک بھر رکھے ہیں اور غضب خدا کا کہ کوئی ایک مولوی بھی ان کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ حضورؐ کے آخری ایام کا ذکر ہے۔ آپ بسترِ علالت پر تھے۔ کہیں سے چند دینار بطور صدقہ آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ انہیں فوری طور پر ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے بعد آپؐ پر غشی طاری ہو گئی۔ دینار بوجوہ تقسیم نہ ہو سکے۔ آپؐ جب دوبارہ ہوش میں آئے تو پہلا سوال ان دیناروں کے متعلق کیا۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ ابھی تک تقسیم نہیں کئے گئے۔ آپؐ نے سختی سے تاکید کی اور فرمایا کہ اس میں تاخیر کیوں برتی جا رہی ہے۔ محمدؐ اپنے ربّ کے حضور اس حالت میں پیش نہیں ہونا چاہتا کہ کسی ضرورت مند کی موجودگی میں اس کے گھر میں دینار پڑے ہوں ! اللہ اکبر ! ایک دوسری حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا بھی ہوتا تو میں شام ہونے سے پہلے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتا۔ آپؐ کے پہلے جانشین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وظیفے کا سوال جب سامنے آیا تو آپ نے فرمایا اس کا تعین میں خود کرونگا اور یہ ایک مزدور کی اُجرت کے برابر ہو گا۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ اگر اس میں آپ کا گذارہ نہ ہو سکا۔ آپ نے فرمایا۔ تو پھر میں اس مزدور کی اُجرت میں اضافہ کر دونگا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا حال تو آپ سن چکے ہیں۔ یہی حال حضرت عثمانؓ کا تھا۔ آج اسلام پسندوں میں اُن کی دولت کے بڑے چرچے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں سرمایہ داری انہی کی مزعومہ دولت کے جواز پر پنپ رہی ہے۔ ہمیں علم نہیں کہ حضرت عثمانؓ کی دولت کے چرچے محض افسانوی ہیں یا حقائق پر مبنی ہیں۔ کیونکہ حضورؐ کے دَور کے آخری ایام تک تو ہمیں آپؐ کے اصحاب میں ایک بھی سرمایہ دار نظر نہیں آتا۔ قرآنِ کریم شاہد ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر اسلامی لشکر کو بار برداری کیلئے جانور تک میسّر نہیں تھے۔ لوگ آتے لیکن آنکھوں میں آنسو لئے لوٹتے۔ کیونکہ حضورؐ فرماتے تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے سواری نہیں ہے۔ اگر اس وقت حضرت عثمانؓ کے پاس یا کسی دوسرے صحابیؓ کے پاس دولت ہوتی تو قرآنِ کریم یہ کیفیت کبھی بیان نہ کرتا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد اگر حضرت عثمانؓ کے پاس دولت اکٹھی ہو گئی ہو تو اس کا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ آپ کی دولت حاجت مندوں کی حاجت روائی کیلئے صرف ہوتی ہو گی۔ تجوریاں بھرنے، محلّات تعمیر کرنے، اور عیش پرستی میں ایک کوڑی بھی صرف نہیں ہوئی ہو گی۔ مدینے کی سرزمین سینہ کھولے اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ وہاں ایک سرمایہ دار بھی آباد نہیں تھا۔ ایک عظیم مملکت کا پایہ تخت ہونے کے باوجود آپ کو وہاں محلّات تو درکنار ایک آدھ پختہ مکان کے آثار بھی دکھائی نہیں دیتے۔ سچ بات یہ ہے

کہ ان لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ اس دنیا کا مال و دولت صرف زادِ راہ ہے اور یہ زندگی درحقیقت اُخروی اور دائمی زندگی کے لئے تیاری کا میدانِ سعیٔ و عمل تھا اور ان کا ہر قدم اسی سمت کی طرف اُٹھتا تھا اور یہی قرآن کی اصل اور اساسی تعلیم ہے۔ **لَعَلَّهُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ**۔

اسلام ایک ایسا معاشرتی نظام پیش کرتا ہے کہ جس میں ہر طرح کی طبقاتی کشمکش کو قانونی طور پر ختم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ صرف قرآنِ کریم کی طرف رجوع کیا جائے۔ قرآنِ کریم میں نہ تو حکمرانوں کے لئے مخصوص تحفظات موجود ہیں اور نہ سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے لئے بے حدّ و حساب دولت اکٹھا کرنے کا کوئی جواز پایا جاتا ہے اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ختمِ نبوّت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اب خدا اور بندے کے درمیان قرآنِ کریم کے علاوہ کوئی شخص حائل نہیں ہو گا۔ دین کی تعلیم حاصل کرنا اور اسے دوسروں کو منتقل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے معاوضہ طلب کرنا ایک مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ جتنے بھی انبیاء اکرام آئے سب نے آکر یہی ایک اعلان کیا کہ ہم اجر کے طلب گار نہیں ہیں۔ وہ کہتے تھے:

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَo "ہمارا اجر ہمارے ربّ کے ساتھ ہے"۔ آپ کو معلوم ہے کہ مذہبی پیشوائیت پنپتی ہی اَجر پر ہے۔ آج ان کی اُجرت بند کر دی جائے آپ کو ایک مولوی بھی دکھائی نہیں دے گا۔ (الا ماشاء اللہ)۔

اسلام کا اوّلین دور، تاریخ انسانیت کا مثالی دَور ہے۔ اس دَور میں ہر نوع کی تفاوت مِٹ چکی تھی۔ معاشرے میں ایسا رزق دستیاب تھا کہ جس سے پیٹ بھی بھرتا اور دلوں کو اطمینان بھی نصیب ہوتا تھا۔ ہر فرد کی عزّتِ نفس محفوظ تھی۔ اُس دَور میں اسلامی مملکت دنیا کی واحد سپرپاور بن چکی تھی۔ اس کے خزانے سیم و زر سے مالا مال تھے۔ ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی کا دَور دَورہ تھا۔ لیکن یہ سب کچھ وحیٔ خداوندی کی رہنمائی میں حاصل ہؤا تھا اور اس کے مطابق زندگی بسر ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اُس دَور کے ایک ایک بستی کو چھان ڈالئے آپ کو کہیں بھی نہ محلّات دکھائی دیں گے، نہ بارہ دریاں، نہ باغ باغیچے، نہ شاندار مساجد اور نہ ہی پُرشکوہ یادگاریں! ان کے ہاں نہ تو طرب و نشاط کی محفلیں جمتی تھیں اور نہ کسی کے عشق کی داستان نے جنم لیا! بات یہ بھی نہیں تھی کہ یہ لوگ ان رنگینوں اور عیش سامانیوں سے ناواقف تھے یا یہ کہ ان کے دین نے ان پر یہ چیزیں حرام قرار دے رکھی تھیں۔ یہ لوگ اِن سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے قیصر و کسریٰ اور روم جیسی شاندار سلطنتیں فتح کر رکھی تھیں اور ان سلطنتوں کے رؤسا و امراء کی داستانیں ان کے سامنے تھیں۔ یہ مجذوب، قلندر اور صوفی منش بھی نہ تھے۔ زندگی کی جِدّوجُہد میں حصّہ لینا اور اپنی محنت

کے ماحصل سے لطف اندوز ہونا اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ دین نے زیب و زینت کی چیزیں حلال کر رکھی تھیں۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں احساسِ ذمّہ داری جو اُن کیلئے زندگی کی متاعِ گراں تھا۔ اُس نے اِن کی کمر توڑ رکھی تھی۔ اُن کا ایمان تھا ایک دن ربّ کے حضور پیش ہونا ہے اور اپنے ایک ایک عمل کے لئے جوابدہ ہونا ہے۔ وہاں پوچھا جائے گا کہ کہاں سے لیا اور کدھر خرچ کیا؟

یہی وہ احساسِ ذمّہ داری تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی آرام و سکون اور فائدے کی پرواہ نہ کی بلکہ ہمیشہ دوسروں کا خیال مقدم رکھا۔ وہ انسانوں کی حاجت روائی کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے۔ ان کا دین اس بات کا متقاضی تھا کہ ہمیشہ انصاف کرو۔ خواہ دشمن کیوں نہ ہو! ہمیشہ سچی شہادت دو۔ خواہ اپنی ذات کے خلاف کیوں نہ ہو! فحاشی سے دُور رہو۔ خواہ ظاہر ہو یا باطن! ہر ایک کو اُس کی صلاحیت کے مطابق پرکھو! کسی کا استحصال نہ کرو! ہر ایک کو اُس کی ضرورت کے مطابق دو! اگر یہ دل سے نہ ہو سکے تو اسے احسان سے پورا کر دو! تمہارا دین رسومات ادا کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ معاشرتی مسائل کو حل کر کے حقیقی خوشحالی اور امن و سلامتی کا ضامن ہے۔ ان کے معاشرے میں کوئی تفاوت، کوئی تفرقہ، کوئی طبقاتی جنگ نہ تھی۔ حکمران، سرمایہ دار، علماء، عوام سب ہی ایک مشین کے کل پرزے تھے۔ کسی نے بھی نہ تو خاص حُلیہ اختیار کر رکھا تھا اور نہ ان کے رہن سہن میں کوئی فرق تھا۔ ان میں اس قدر ہم آہنگی اور ربطِ باہمی تھا کہ اُن کے درمیان شناخت کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ حاکم کون ہے اور محکوم کون؟ مالک کون ہے؟ اور ملازم کون؟ عالم کون ہے اور جاہل کون؟ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ روم کے شہنشاہ کا سفیر مدینہ آیا، اور اسے پوچھنا پڑا کہ خلیفۂ وقت کہاں ہیں؟

آج اسلامی معاشرے میں جو کچھ نظر آرہا ہے اور اس کے جواز میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں، ان کے متعلّق اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کِذب و افتراء ہے۔ اس کا قرآنِ کریم کے اصولوں سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ موجودہ معاشرتی نظام میں کسی بھی انسان کیلئے اپنے قول و فعل میں مطابقت پیدا کرنا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جس نظام میں خود غرضی اور نفس پرستی اس حد تک سرایت کر چکی ہو کہ بھائی بھائی کا خیال نہ رکھتا ہو۔ ایک امیر ہو اور دوسرا غریب۔ ہر ایک کو اپنے حقوق کا تحفّظ خود کرنا پڑتا ہو۔ کوئی کسی کا دمساز اور غمگسار نہ ہو۔ اربابِ حل و عقد عیاشیوں میں ڈُوبے ہوں اور معاشرے میں نہ تو اعلیٰ اقدار ہوں اور نہ تربیت کا مناسب انتظام تو ایسے معاشرے میں قول و فعل کا تضاد پیدا ہو جانا کیا کچھ عجیب بات ہے؟ قول و فعل میں تضاد صالح معاشرتی نظام سے دُور ہو سکتا ہے جس کی بنیاد اللہ اور آخرت پر بھرپُور ایمان ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو قرآنِ خالص کی طرف دعوت دی جائے۔ اصل

حقیقت قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ جو کہ ابھی تک نگاہوں سے اوجھل ہے۔ جب وہ سامنے آئے گی تو معاشرہ ایک بار پھر سے حق و صداقت کی شاہراہ پر چل پڑے گا۔ ہر ایک کو حق بات کہنے میں آسانی ہو گی اور ہر ایک کے حقوق محفوظ ہوں گے۔ قول و فعل کا موجودہ تضاد جو اس وقت بھیانک ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے اپنی موت آپ مر جائے گا۔ اس لئے ہم میں سے ہر ایک کا فرض اس حکم کی بجا آوری ہے جو اللہ نے اپنے رسول کو ان الفاظ میں دیا تھا۔ **بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ** (5/67)۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درسِ قرآنِ کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے۔

شہر و مقام		دن	وقت
کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فِٹ رائٹ شوز شاپ	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
حیدر آباد	12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل نسیم نگر قاسم آباد	جمعۃ المبارک بعد نماز عصر	

دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر۔ جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ، مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ:

ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر، بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)
ٹیلی فون: کراچی 4571919 حیدر آباد 654906

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

آفتاب عروج
(کنونشن 94ء میں پڑھا جانے والا ایک مضمون)

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

خارجی کائنات میں قوانین فطرت ایک مروجہ اصطلاح ہے جسے ہر وہ شخص خواہ وہ کسی بھی دین یا مذہب کا پیرو کار کیوں نہ ہو ان قوانین فطرت کو تسلیم کرتا ہے جو کہ غیر متبدل اور اٹل ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "خدا کا قانون اٹل ہے تم اس میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤ گے"۔ 35/43_ لیکن محترم پرویز صاحب نے ہمیں ایک ایسی اصطلاح سے متعارف کرایا جس کا نام "قوانین خداوندی" ہے ورنہ ازیں پیشتر کم از کم برصغیر کے اسلامی لٹریچر میں یہ اصطلاح مروج نہ تھی۔ اس نئی اصطلاح "قوانین خداوندی" نے ہمارے لئے تفہیم دین کے دروازے وا کر دیئے۔ ورنہ ہم دین کو سمجھنے میں اکثر ٹامک ٹوئیاں ہی مارا کرتے تھے یا پھر ثواب و تقدس کی چادر اوڑھ کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ اب ہم کچھ بھی دیر بعد انہیں دو اصطلاحات کے متعلق بالترتیب بات کریں گے۔

سب سے پہلے ہم قوانین فطرت پر بات کرتے ہیں جنہیں چند مثالوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ امید ہے کہ آپ پر بار خاطر نہ ہونگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی ہمیں مثالوں کے ذریعے ہی سمجھاتے ہیں اور ہم بھی مثالوں کے ذریعے ہی سمجھ پاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو مثال کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اے رسول! تم بھی اسے اپنی جماعت (مومنین) کے سامنے پیش کرو اور ان سے کہو اسے دل کے کانوں سے سن لیں۔ (7/175)

مثال نمبر1

اگر ہم نے پانی گرم کرنا ہو تو اس کے لئے آگ کی ضرورت ہو گی۔ آگ کی فطرت ہے حدت پیدا کرنا جلا کر راکھ کر دینا۔ پانی گرم کرنے کے لئے ہمیں کسی برتن کی بھی ضرورت ہو گی۔ جو آگ اور پانی میں حد فاصل قائم رکھ سکے۔ پانی کو آگ پر گرنے نہ دے۔ اگر براہ راست پانی کو گرم کرنے کے لئے آگ پر ڈال دیں گے تو ظاہر ہے کہ آگ بجھ جائے گی۔ کیونکہ پانی کی فطرت ہے آگ کو ٹھنڈا کرنا بجھا دینا۔ علاوہ ازیں

ہمیں آگ جلانے کے لئے خس و خاشاک یا لکڑیوں کی ضرورت پڑے گی۔ جن میں جلنے کی صلاحیت موجود ہے ان لکڑیوں اور خس و خاشاک کو آگ دکھانے کے لئے دیا سلائی بھی تلاش کرنا پڑے گی۔ اس مثال سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ پانی گرم کرنے لئے ہمیں کن کن اسباب و ذرائع کو بروئے کار لانا پڑے گا۔

پانی کی مثال پر دوبارہ غور فرمایئے۔ پانی کا فطری خاصہ ہے کہ وہ آگ کو بجھا دیتا ہے۔ لیکن اسی پانی کے اجزائے ترکیبی کو اب الگ الگ کر دیا جائے اور پانی کا قطرہ ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل ہو جائے تو ان اجزاء کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ (آگ بجھانا تو ایک طرف) ہائیڈروجن خود جلتی ہے اور آکسیجن جلنے میں مدد دیتی ہے۔ یعنی پانی کے اجزائے ترکیبی میں سے کسی جزو میں بھی پانی کی خاصیت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ اس کے برعکس خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مثال نمبر2

گندم کا دانہ۔ گندم کا دانہ بونے اور اس کے بار آور ہونے کے لئے مندرجہ ذیل اسباب و قوانین کی ضرورت ہو گی۔ (1) زر خیز مٹی (2) مٹی میں نمی کی خاص مقدار کا ہونا (3) دھوپ (4) ہوا (5) بذات خود اس دانہ میں بار آور ہونے کی صلاحیت کا ہونا۔ اگر گندم کے دانہ کے اندر بار آور ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو باقی تمام قوانین فطرت اس گندم کے دانہ کے بار آور ہونے میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ گندم کے دانہ میں بار آور ہونے کی صلاحیت تو موجود ہے لیکن باقی قوانین فطرت میں سے کوئی ایک بھی گندم کے دانہ کا ساتھ نہ دے تو گندم کا دانہ کبھی بھی بار آور نہیں ہو سکے گا۔

مثال نمبر3

کارتوس جو ہمارے مقالہ کا سر عنوان بھی ہے۔ بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ مختلف اجزا کا مجموعہ ہے۔ جب ان اجزا کو ایک خاص تناسب کے ساتھ مختلف مراحل سے گذارنے کے بعد ایک خاص قالب میں ڈھالا گیا تو یہ کارتوس کی شکل اختیار کر گیا۔ جن اجزاء کو اکٹھا کرنے سے کارتوس وجود میں آیا وہ یہ ہیں۔ (1) گندھک (2) پوٹاس (3) کوئلہ (4) گتہ (5) پیتل یا لوہا (6) سکہ۔ جب کارتوس بن کر تیار ہو گیا تب بھی محض بیکار تھا۔ تاوقتیکہ اسے داغنے کے لئے بندوق دستیاب نہ ہو۔ اب بندوق بنانے کے لئے ہمیں پھر مختلف اجزاء کی ضرورت ہو گی۔ گویا ہمیں پھر مختلف اجزاء کو ترتیب و تناسب کے ساتھ ایک خاص نظام کے تحت مختلف مراحل سے گذارنے کے بعد مختلف قالبوں میں ڈھالنا پڑے گا۔ پھر کہیں جا کر بندوق تیار ہو گی۔ بندوق تیار ہو کر بھی محض بیکار تھی جب تک اس کے لئے گولی یا کارتوس مہیا نہ کر دیئے جائیں۔ گویا کہ کارتوس اور بندوق ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قرار پائے۔ ایک کا وجود دوسرے کے لئے لاینفک ٹھہرا۔

کارتوس تیار ہوا' بندوق بھی تیار ہو گئی- یہ دونوں تیار ہو کر بھی بیکار پڑے تھے جب تک انہیں استعمال کرنے والا انسانی ہاتھ نہ تھا اور اسکے استعمال کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان میں رکھ دی- قرآن کریم میں ارشاد ہے خدا نے انسان میں اس قسم کی صلاحیت رکھ دی جس کی بنا پر اس کے لئے ممکن ہو گیا کہ وہ ان کا علم حاصل کر سکے- (2/31)

توانائی نمبر 4

کائنات کا ایک قانون توانائی بھی ہے- جس کا دائرہ ارض و سماء پر محیط ہے- توانائی کے بغیر کچھ بھی ہونا ناممکنات میں سے ہے- ہر حرکت میں توانائی پنہاں ہے آپ کو اپنی اور اپنے ملک کے دفاع کی خاطر توانائی کی اشد ضرورت ہے- انسانیت کی حفاظت اور خدا کی کبریائی قائم کرنے کی خاطر توانائی کی ضرورت ہے- ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے توانائی کی ضرورت ہے- تحفظ خویش کی یہ طاقت ہر جاندار کو اللہ تعالیٰ نے عطا کر رکھی ہے- انسانی دنیا میں یہ طاقت (توانائی) انسانوں کے اتحاد و عمل میں ہم آہنگی اور کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے سے حاصل ہوتی ہے- کائنات کی پستیوں اور بلندیوں جو کچھ ہے اس نے سب کو تمہارے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے- (45/13)

سامعین محترم ! سطور بالا میں مثالوں کے ذریعے جن قوانین فطرت اور اسباب و ذرائع کا ذکر کیا گیا ہے- ان قوانین میں سے کسی ایک قانون کی بھی خلاف ورزی کریں گے تو ان سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہونگے- اس سے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان قوانین میں کوئی خرابی واقع ہو چکی ہے یا یہ اب اپنی افادیت کھو چکے ہیں- اس وقت ان کے وہ نتائج مرتب نہیں ہو سکتے جو دو ہزار سال قبل مرتب ہوتے تھے- زہر آج بھی قاطع زندگی ہے ہزاروں سال قبل بھی قاطع زندگی تھا- فصل اگانے کے قوانین آج بھی وہی ہیں جو ہزاروں سال پہلے تھے- جو کسان آج بھی ان قوانین سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تو اس میں ان قوانین کا تو کوئی قصور نہیں- آگ ہزاروں سال قبل بھی جلا کر راکھ کر دیتی تھی اور آج بھی آگ میں جو کوئی انگلی ڈالے گا وہ جل جائے گی- پانی ہزاروں لاکھوں سال قبل بھی نشیب کی طرف بہتا تھا اور آج بھی نشیب کی طرف بہتا ہے- وائرلیس ریز اور ایکس ریز ہزاروں لاکھوں سال قبل بھی موجود تھیں اور آج بھی موجود ہیں- اگر ہزاروں برس پہلے کے انسان نے انہیں دریافت کر کے ان سے استفادہ حاصل کرنے کی سعی نہیں کی تو وائرلیس ریز ایکس ریز کا اس میں کیا قصور ہے- آج کا انسان وائرلیس ریز اور ایکس ریز کو دریافت کر کے بے پناہ فوائد حاصل کر رہا ہے تو موجودہ دور کے انسان کا کمال ہے جو کہ قابل صد ستائش ہے- ان قوانین کا تو اعلان ہے کہ "ہے کوئی جو ہم سے فائدہ حاصل کرے"- (القمر 50)- اس وقت ہمارا سلسلہ کلام صرف سمجھنے

کی حد تک قوانین فطرت یا مادی قوانین ہے۔ ورنہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق تو ان قوانین اور ارض و سماء کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ انسانوں کے اعمال بے نتیجہ نہ رہ جائیں۔ ارشاد ہے خدا نے تمام کائنات کو بالحق پیدا کیا (یونہی بیکار اور تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا۔ مقصد اس سے یہ ہے) کہ ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ برآمد ہو جائے اور کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہو۔ یہ تمام کارگہ کائنات اس لئے سرگرم عمل ہے کہ انسان کا ہر عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ پیدا کرے۔ اب یہاں دیکھئے کہ مادی اور انسانی قوانین کی تخصیص ختم ہو گئی۔ یہ تمام کارگہ کائنات کا وجود ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ٹھہرا۔ جس طرح کارتوس کے لئے بندوق اور ان دنوں کے لئے انسانی ہاتھ۔ گندم کے دانہ کے لئے مٹی' پانی' دھوپ اور ہوا وغیرہ۔

سامعین محترم! اب ہم آفاقی دنیا (قوانین فطرت) سے نکل کر انفس کی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جل جاتے ہیں۔ یہیں وہ پل صراط ہے جو بال سے بھی زیادہ باریک اور تلوار سے بھی زیادہ تیز ہے.....

شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

انسان کے علاوہ باقی تمام مخلوقات میں اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے اندر ہدایت (جبلت) رکھ دی تھی۔ انہوں نے جو کچھ بننا تھا بن چکے۔ شیر کے لئے یہ حکم کہ تمہارے لئے گوشت اور خون حلال ہے اور گھاس حرام ہے۔ شیر اپنی پیدائش سے لیکر موت تک اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل پیرا رہتا ہے۔ بکری کو حکم ہوا کہ تم پر گوشت حرام ہے اور گھاس حلال کر دی گئی ہے۔ بکری نے بھی عمر بھر اس حکم کا اتباع کیا۔ یعنی انسان کے علاوہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بجا آوری کے لئے مجبور ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کوئی ہے طوعاً" کرہاً" ہمارے قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ سورۃ الرعد (14:15)۔ لیکن انسانوں کی ہدائت کے لئے دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا وہ طریقہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق کسی ایک انسان کو چن لیتے اور اس پر براہ راست وحی (ہدائت) نازل فرماتے۔ ہم نے تجھے تلاش حقیقت میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھایا۔ (93/7)

جس شخص کو اللہ کی جانب سے وحی ملتی اسے نبی اور رسول کہا جاتا۔ بلا شبہ یہ اللہ کا بڑا ہی احسان تھا۔ کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا جو انہی میں سے ہے جو قوانین خداوندی (وحی) (یہاں محترم پرویز صاحب قرآنی ہدایات و احکامات کو قوانین خداوندی کہہ کر ہمارا تعارف کراتے ہیں) کو ان کے سامنے پیش کرتا

ہے اور ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے (اس نے ہدائت کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ اس سے پہلے یہ کھلی گمراہی میں تھے۔ (62/2)- جب وہ حضرات نبوت و رسالت کے عہدہ جلیلہ پہ سرفراز کر دیئے جاتے تو اللہ تعالیٰ اس ہدایت (وحی خداوندی) کو دوسرے انسانوں تک پہچانے کا حکم دیتے۔ ارشاد باری تعالیٰ۔ اٹھ اور ان لوگوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ (74/2)- پھر ارشاد ہوا تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے لوگوں پر آشکارہ کیئے جاؤ اور مشرکوں کی پرواہ نہ کرو۔ (15/94)- مکرر ارشاد ہوا۔ اپنے رب کی طرف دعوت دیتے رہو یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو۔ (67-87 /22-28)- مزید تاکید کی گئی۔ تم انہیں (پند و نصیحت) کی ایسی باتیں کہو جو ان کے دل میں اتر جائیں۔ (63/ 4)- یہاں یہ عرض کر دینا بیحد ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدائت (وحی خداوندی) رسول کو ملی وہ انسانوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ دل میں اتاری جا رہی ہے۔ اوپر سے ٹھونسی نہیں جا رہی۔ ہم سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم قرآن کی صداقتوں پر ایمان لے آؤ تو اس میں تمہارے لئے شفا ہے اور رحمت ہے اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ اللہ تمہارے لئے رحمت چاہتا ہے۔ ان صداقتوں پر عمل درآمد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مردہ انسانوں میں بھی زندگی کی لہر پیدا ہو کر ان میں باز آفرینی کی صلاحتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ قوم لہلہاتی کھیتیوں کی طرح خوشبوؤں' مسرتوں اور رحمتوں کے گلشن وجود میں لا کر دنیا کو جنت نظیر بنا دیتی ہیں۔ خوف' عدم تحفظ اور دہشت کے بھڑکتے شعلوں' دھڑکتے اور پھڑکتے دلوں پر امن' آشتی' اطمینان قلب اور تحفظ کی بارش برسا کر دلوں میں طمانیت اور سکون کی خوشگوار راحت عطا ہو جاتی ہے۔ افراد معاشرہ کو تعلیم و تربیت کی بھٹی میں ڈال کر تغیر نفس کے مختلف قالبوں میں ڈھال کر مختلف مشقت طلب اور جاں گسل مراحل سے گذار کر ایسی توانائی و حرارت پیدا کر دی جاتی ہے جس سے انسانی زندگی کے اجتماعی تعمیری مقاصد کا پہیہ نہائت برق رفتار کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ ان میں یقین محکم اتحاد' عمل پیہم کی ہم آہنگی اور قوانین فطرت پر دسترس حاصل کرنے کے بعد ایسی قوت (کارتوس) پیدا ہو جاتی ہے جو انسانیت کو مکمل تحفظ کی ضمانت اور دنیا میں جنگ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہی نظریہ زندگی' وہی مسلک حیات وہی نظام انسانی باقی رہ سکتا ہے۔ جو تمام نوع انسانی کے لئے منفعت کا موجب ہو۔ (13/17)

یہ باتیں واقعی ہمارے دل میں اتر گئیں۔ ہم ان پر ایمان لے آئے اور بارگاہ رسالت ماب میں حاضر ہو کر ان کے دست مبارک پہ ہاتھ رکھ کر یہ ذمہ داری اٹھانے کا اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا (33/73)- کہ جو ذمہ داری آپ ہمیں سونپ رہے ہیں ہم اس پر عمل درآمد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھیں گے۔ اگر اس نظام کے آگے کسی نے رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو ہم اس سے ٹکرا جائیں گے اور اس ٹکراؤ میں

ہمیں اپنی جان بھی دینی پڑے تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔ پھر ہم نے اس نظام کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ جو ہم نے کہا تھا کر دکھانے نکل پڑے۔ تو مزاحمت شروع ہو گئی۔ ہم نہایت دلجمعی اور ثابت قدمی کے ساتھ ٹکرا گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں ثابت قدم پایا تو اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ تم جس حتم و یقین سے حق و صداقت کے لئے لڑ رہے ہو اب تمہیں خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید حاصل ہو گی (3/124)۔ اس سے تمہارے قدموں میں استقامت پیدا ہو جائے گی۔ ہم تمہیں دنیا میں سربلند و سرفراز رکھیں گے تم اپنے مشن کی سرانجام دہی میں جمے رہو۔ ہم تمہیں دوسری اقوام کے مقابلہ میں غلبہ عطا فرمائیں گے۔ (138/3)۔ یاد رکھو اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ ہم لڑے' مرے اور مر مر کر زندہ ہوئے۔

انسانیت کی بقا کی خاطر' اللہ کی کبریائی قائم کرنے کی خاطر۔ اس کے بعد حسب وعدہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکومت عطا فرمائی اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان زمینوں کا' ان کے گھر بار کا اور ان کے مال اسباب کا مالک بنا دیا۔ خدا نے ہمیں ایسے ممالک کا بھی مالک بنا دیا جن پر ابھی ہمارے پاؤں بھی نہ پڑے تھے۔ پہلے دس لاکھ مربع میل پھر بائیس لاکھ مربع میل تک ایک جنت نظیر نظام قائم کر دیا گیا۔ تمام دنیا نے اس جنت نظیر دور کی شہادت دی۔ وہ کچھ عرصہ قائم رہا لیکن..... وائے افسوس..... صد افسوس..... ہم نے اپنی بات بھی بدل ڈالی۔ ہم نے اللہ سے کئے وعدوں کو پس پشت ڈال دیا۔ یعنی جن قرآنی صداقتوں پر ایمان لانے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا رسولؐ کے دست مبارک پر ہاتھ رکھ کر اللہ سے عہد باندھا تھا خصوصاً وہ بنیادی صداقت جسے قانون نظام وحدت (توحید) کہا جاتا ہے۔ جس کے بغیر نہ تو ہمارا ایمان مکمل ہوتا ہے اور نہ ہمارے کسی بھی عمل کا تعمیری نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ! تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم سب کے سب بلا استثناء اجتماعی طور پر اس نظام (وحدت) کے ساتھ محکم طور پر وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت آنے دو۔ (3/102)۔ اس قانون کا اطلاق تمام کائنات پر بھی ہوتا ہے۔ جب بھی کسی چیز' فرد یا قوم نے نظام وحدت (توحید) سے منسلک رہنے کے عہد کو توڑا تو وہ بغاوت (شرک جو ناقابل معافی جرم ہے۔ (6/65)-) کا مرتکب ہو گیا جس کی سزا موت ہے۔ اس بغاوت اور اس کی سزا موت کے عمل کو چشم دید اور حیرت آموز واقعہ کے طور پر دیکھنا ہو تو امت مسلمہ کو دیکھئے کہ جو نظام وحدت سے منسلک رہنے کے عہد کو توڑ کر بغاوت کی مرتکب ہوئی تو اللہ تعالیٰ کے قانون نظام وحدت نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے موت کی نیند سلا دیا۔ دوسرا واقعہ ابھی حال ہی میں کائنات میں وقوع پذیر ہوا ہے گذشتہ دنوں ایک سیارہ شو میکر لیوی 19 جب اپنے مدار (نظام وحدت) سے الگ ہوا تو اللہ تعالیٰ کے قانون نظام وحدت نے اس کے بائیس ٹکڑے کر کے دوسرے سیارہ مشتری میں دے مارا۔ اب وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی ٹھنڈی آغوش میں چلا

گیا جس قانون کے مطابق اجرام فلکی نے چلنا تھا اس کی وحی ان کی طرف کر دی گئی۔ (41/12)

ارشاد باری تعالیٰ۔ انسانی دنیا میں غلط نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر والے طبقے میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت کی وبا پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے لڑنے لگ جاتے ہیں اور یوں وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ (6/130)۔ جب انسان کا ایک قدم غلط سمت اٹھ جاتا ہے تو پھر اٹھتا ہی چلا جاتا ہے جب ہم نے ایک بات بدلی تو پھر ہم بدلتے ہی چلے گئے۔ ہم نے جو خدا سے ذمہ داریاں نبھانے کے عہد و پیماں باندھے تھے انہیں ایک ایک کر کے توڑنا شروع کر دیا۔ اپنے کئے ہوئے عہدوں کو اٹھا کر پھینک دیا۔ پھر ہمارے دل پتھر ہو گئے۔ احساس زیاں جاتا رہا۔ جس کے نتیجہ میں اب دنیا بھر کی ذلتیں اور رسوائیاں سائے کی طرح ہمارے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ سرزمینیں جو ہمارے نام لکھ دی گئی تھیں ہم پہ حرام کر دی گئیں اور ہمارے آگے جہالت کی دیواریں کھینچ دی گئیں اور ہماری آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور ہم بصیرت سے محروم ہو کر ایک دوسرے سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ "کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟؟....."

موضوعات بزم مذاکرہ

1- میں نے قرآن سے اب تک کیا سیکھا؟
2- قرآن خالص کی تعلیم کیوں عام نہیں ہو رہی؟
3- ہم اپنی روز مرہ زندگی میں قرآن کریم کو اس کا جائز مقام کیوں نہیں دیتے؟
4- قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں؟
5- مغرب کی ثقافتی یلغار (بالخصوص) فحاشی کا مقابلہ قرآنی حوالہ سے۔
6- ہمارے نظام تعلیم کی خرابیاں اور اصلاح کے طریقے قرآن کی روشنی میں۔
7- عورتیں بھی انسان ہیں!
8- Population Explotion and its Quranic Solution

صرف بی اے فائنل اور ایم اے کے طلبا و طالبات حصہ لے سکیں گے۔
منتخب مقالہ جات پڑھنے کے لئے 10 منٹ دیئے جائیں گے۔

پاکستان میں

علامہ غلام احمد پرویزؒ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
1- ایبٹ آباد	595 کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین	منگل	3 بجے سہ پہر
2- ایبٹ آباد	K/355 کنج روڈ فون:5729	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
3- بورے والا	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر5۔ رابطہ فون:2438	پہلا اور تیسرا جمعہ	9 بجے صبح
4- پشاور	دفتر جناب عبداللہ ثانی صاحب ایڈووکیٹ۔ کابلی بازار۔ رابطہ: 270737	ہر بدھ و جمعہ	5 بجے شام
5- پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	4 بجے شام
6- پیر محل	مکان نمبر139/140- مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	9 بجے صبح
7- پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	3 بجے سہ پہر
8- جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد' جی۔ ٹی روڈ	جمعۃ المبارک	6 بجے شام
9- جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	10 بجے صبح
10- چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
11- چک 215 ای۔ بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	جمعۃ المبارک	8 بجے صبح
12- حیدر آباد	مکان نمبر501 مشرق گلی نمبر1' عثمان آباد (گٹو شالہ)	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
13- حیدر آباد	B-12 قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر	جمعۃ المبارک	بعد نماز عصر
14- ڈی۔ جی خان	بلاک G- کچہری روڈ' رابطہ انیس الرحمان فون: 61519	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح
15- رجانہ	برمکان چوہدری ایس۔ ایم صادق' مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	10 بجے صبح
16- راولپنڈی	بمقام 4385/47-E اپر سٹوری ہائی وے آٹوز نزد پل لئی گوا لمنڈی راولپنڈی فون: 74752	جمعۃ المبارک	4-30 بجے شام
17- سرگودھا	60- اے سول لائنز' ریلوے روڈ۔ رابطہ فون: 720083	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح

شہر	مقام	دن	وقت
18- سیالکوٹ	محمد افضل خلجی' ایبٹ روڈ۔ رابطہ فون: 87658	پہلا اور دوسرا جمعہ	10 بجے صبح
19- فیصل آباد	23- سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون: 720096	ہر جمعۃ المبارک	5 بجے شام
20- کراچی	چمن زاہد 19- بی بلاک 13- ڈی گلشن اقبال مقابل اردو سائنس کالج رابطہ خالد گل فون: 539798	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
21- کراچی	مکان 16 گلشن مارکیٹ' C/36 ایریا کورنگی 5 رابطہ: محمد سرور' فون: 312631	جمعۃ المبارک	11-30 بجے صبح
22- کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ ایاز حسین انصاری رابطہ فون: 4571919	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
23- کراچی	برمکان محمد یونس 1206- گلی 10- اے' G-36' شریف کالونی۔ لانڈھی رابطہ: فون: 312631	اتوار	8 بجے شب
24- کوہاٹ	برمکان شیر محمد' نزد جناح لائبریری	جمعۃ المبارک	8 بجے صبح
25- کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ	جمعۃ المبارک	4 بجے سہ پہر
26- گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ' سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
27- گجرات	مرزا ہسپتال' کچہری روڈ	جمعرات	3 بجے
28- لاہور	25- بی گلبرگ II (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
29- لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	جمعۃ المبارک	بعد نماز مغرب
30- ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح
31- مامون کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک 509 گ ب	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
32- اوکاڑہ	برمکان میاں محمد سعید مکان 116 گلی 6 سیٹھ کالونی نمبر 2 رابطہ فون: 3660	ہر جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
33- واہ کینٹ	برمکان محمد داؤد' کوارٹر نمبر 19E/119	بدھ	بعد نماز عصر

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی دستیاب ہے۔
تحریک طلوع اسلام سے متعلق استفسارات مندرجہ بالا مقامات پر موجود کارکنان تحریک کے حوالہ کیجئے۔ جواب ادارہ سے براہ راست دیا جائیگا۔

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Parwez (r)
BOOKS AND MAGAZINE TOLU-E-ISLAM ARE ALSO AVAILABLE AT THE FOLLOWING PLACES.

1.	**CANADA** 716 The West Mall,Suit 1804 Etobicoke, ONT (416) 620-4471	First Sun 11AM
2.	**DENMARK** Herninggade 8.st th., 2100 Copenhagen 0	Last Sat 2 PM
3.	**Kuwait** Flat No. 6, Floor No. 3 Taher Bu Hamad Building Oppsite Al-Othman Mosque, Hawally, Kuwait	Friday 5.PM
4.	**NORWAY** Akeberg Veien-56, Oslo-6 Galgeberg, 4th floor	1st Sun 4PM
5.	**UNITED KINGDIM**	
(i)	Birmingham 229 Alum Rock Road	Sunday 3PM
(ii)	London 76 Park Road Ilford Essex Phone 081-553-1896	1st Sun 2:30PM
(iii)	Yardley 633 Church Road, Yardley, Birmingham B33 8HA (Phone 021-628-3718)	Last Sun 2PM
(iv)	Essex 50 Arlington Road, Southend-on-Sea ESSEX SS2 4UW, Phone 0702-618819	2nd Sun 3PM
(v)	Yorkshire Cardigan Community Centre 145-49 Cardigan Road LEEDS-6 Contact M. Afzal Phone 0532-306140	1st Sun 3PM

ON AIR

Dars-e-Quran
Oslo (NORWAY) — **Thursday 21:00PM**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تحریک پاکستان کی دینی اساس سے متعلق، ذاتی مشیر، منفرد مفکر قرآن
بانی تحریک طلوع اسلام اور تحریک پاکستان گولڈ میڈلسٹ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی تصنیفات

جولائی 1995ء

نام کتاب	قیمت ستوڈنٹ	قیمت اعلیٰ
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ)	Rs.	Rs. 390
(کھلے پارے۔ فی پارہ)	Rs.	Rs. 13
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلد)	Rs.	Rs. 390
(تین جلدوں میں۔ فی جلد)	Rs.	Rs. 130
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلد)	Rs.	Rs. 600
چار جلدوں میں (فی جلد)	Rs.	Rs. 150
تبویب القرآن (تین جلدوں میں)	Rs.	Rs. 475
(ایک جلد میں)	Rs.	Rs. 475
مطالب الفرقان (مکمل سیٹ)	Rs.	Rs. 1100
جلد اول	Rs. 75	Rs. 150
جلد دوم	Rs.	Rs. 150
جلد سوم	Rs. 75	Rs. 150
جلد چہارم	Rs. 100	Rs. 200
جلد پنجم	Rs. 75	Rs. 150
جلد ششم، ہفتم (فی جلد)	Rs.	Rs. 150
من و یزداں	Rs. 100	Rs. 200
ابلیس و آدم	Rs. 90	Rs. 180
جوئے نور	Rs. 80	Rs. 160
برق طور	Rs. 80	Rs. 160
شعلہ مستور	Rs. 80	Rs. 160
معراج انسانیت	Rs. 125	Rs. 250
مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں	Rs. 40	Rs. 80
انسان نے کیا سوچا؟	Rs. 100	Rs. 200
اسلام کیا ہے؟	Rs. 70	Rs. 140

نام کتاب	قیمت ستوڈنٹ	قیمت اعلیٰ
کتاب التقدیر	Rs. 90	Rs. 180
جہان فردا	Rs. 80	Rs. 160
شاہکار رسالت	Rs. 100	Rs. 275
نظام ربوبیت	Rs. 90	Rs. 180
تصوف کی حقیقت	Rs. 90	Rs. 180
قرآنی قوانین	Rs. 35	Rs. 75
سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	Rs. 50	Rs. 120
(جلد دوم)	Rs. 40	Rs. 100
(جلد سوم)	Rs. 60	Rs. 140
طاہرہ کے نام خطوط	Rs. 40	Rs. 80
ختم نبوت اور تحریک احمدیت	Rs.	Rs. 80
حسن کردار کا نقش تابندہ	Rs.	Rs. 40
اقبال اور قرآن (جلد اول)	Rs.	Rs. 80
(جلد دوم)	Rs.	Rs. 120
Islam A Challenge to Religion	Rs. 80	Rs. 160
Exposition of The Holy Quran	Rs.	Rs. 350
Vol. 1 (Upto Sura Al-Kahaf)	Rs.	Rs.
Islamic Way of Living	Rs. 30	Rs. 40
اسلامی معاشرت	Rs. 25	Rs. 75
اسباب زوال امت	Rs. 20	Rs. 60

متفرق کتب

مقام حدیث	Rs. 40	Rs. 120
قرآنی فیصلے (جلد اول) (مشتمل برسابقہ جلد اول، دوم، سوم)	Rs. 120	Rs. 225
قرآنی فیصلے (جلد دوم) (مشتمل برسابقہ جلد چہارم و پنجم)	Rs. 120	Rs. 225
قتل مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	Rs.	Rs. 30
ابلہ مسجد	Rs. 100	Rs.
تحریک پاکستان اور پرویزؒ	Rs. 100	Rs. 250
نوادرات	Rs. 100	Rs.
The Pakistan Idea	Rs. 100	Rs.

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 بی گلبرگ نمبر 2 لاہور 54660 (پاکستان) فون 879246 - فیکس 876219

نوٹ: طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

(ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں- یہ قیمتیں کسی وقت بھی تبدیل کی جا سکتی ہیں)

طلوع اسلام کنونشن

1995ء

طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن اپنے روائتی وقار و سنجیدگی اور سادگی و شادابی کے ساتھ لاہور میں
مؤرخہ 19-20-21 اکتوبر بروز جمعرات' جمعہ و ہفتہ منعقد ہو گی
کنونشن کے دو اجلاس کھلے ہوں گے جن میں وہ تمام حضرات شرکت کر سکیں گے جو ان میں
پیش کردہ مقالات و خطابات و تقاریر کو سنجیدگی اور سکون سے سننا چاہیں۔

مجوزہ پروگرام

- پہلا اجلاس (برائے مندوبین) : 19 اکتوبر' بروز جمعرات' سپہر 3 بجے
- دوسرا کھلا اجلاس : 20 اکتوبر' بروز جمعہ' صبح 9 بجے
- تیسرا اجلاس (بزم مذاکرہ) : 20 اکتوبر' بروز جمعہ' سپہر 3 بجے
- چوتھا اجلاس (برائے اراکین ادارہ) : 21 اکتوبر' بروز ہفتہ' صبح 9 بجے

موضوعات صفحہ 48 اور 74 پر دیکھئے۔

- واضح رہے کہ طلوع اسلام کے اجلاس کی حیثیت عام پبلک جلسوں کی سی نہیں ہوتی۔ یہ ایک طرح کی نہایت سنجیدہ و پروقار علمی محفلیں ہوتی ہیں جن میں نظم و ضبط اور آداب مجلس کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے۔
- بزمہائے مذاکرہ میں تقریری مقابلے انعامی ہوں گے۔ مذاکرہ میں شامل ہونیوالے طلبا و طالبات کو اپنے مقالے کنونشن سے کم از کم 25 دن قبل ادارہ کو ارسال کرنا ہوں گے۔ منتخب مقالہ نگاروں کو اپنا مقالہ خود پڑھنے کی دعوت دی جائے گی۔
- ادارہ کے کیمپ میں حسب سابق رہائش اور کھانے کا بندوبست ہو گا۔
موسم کے مطابق بستر البتہ خود لانا ہو گا۔ کیمپ میں داخلہ بذریعہ دعوت نامہ ہو گا۔

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام